اوراقِ زندگی

بسمِل سعیدی

مُرتّبہ
مخمور سعیدی

ناشر: پی۔ کے پبلیکیشنز، آریہ سماج روڈ، نئی دہلی

قیمت: پندرہ روپے

ملنے کے پتے: شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی۔

مکتبۂ تحریک انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی۔

کتب خانہ عزیزیہ، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔

نازش بک سینٹر 3207 پھاٹک تیلیان، دہلی۔

پہلا ایڈیشن

ایک ہزار —— اپریل ۱۹۷۱ء

مطبوعہ: لبرٹی آرٹ پریس، دہلی

ہوگا تمھارا نام ہی عنوانِ ہر ورق
اوراقِ زندگی کو اُلٹ دیں کہیں سے ہم

فہرست

مُسلسل غزلیں

نظمیں

آبشارِ اشک

ھدیہ

بہ جناب گوپی کرشن اروڑہ، آئی۔ اے۔ ایس، ڈپٹی کمشنر، دہلی

گرتے ہوؤں کو تھامنے والا کہیں جسے
کمزور و ناتواں کا سہارا کہیں جسے

غم کوئی جاں رُبا ہو، وہ غم خوار و چارہ ساز
ہر دردِ لا دوا کا مُداوا کہیں جسے

جو زندگی کی دھوپ سے جھلسے ہوئے ہوں لوگ
جب اُس کے پاس جائیں تو سایا کہیں جسے

پیاسے جو اُس سے دور ترستے ہوں بُوند کو
اُس کے قریب جائیں تو دریا کہیں جسے

جو اک مثال عظمتِ انسانیت کی ہو
اوصاف کا بشر کے نمونہ کہیں جسے

مجموعۂ صفاتِ بنی نوعِ آدمی
تنہا وہ ایک شخص کہ دُنیا کہیں جسے

چہرے پہ دوسروں کی خوشی کا وہ ایک نُور
تاریک غم کدوں کا اُجالا کہیں جسے

محبوبیت وہ شخصیتِ باوقار میں
اپنے تو اپنے، غیر بھی اپنا کہیں جسے

ہر چند ایک پیکرِ انصاف و عدل ہو
الطاف و مہر و رحم سراپا کہیں جسے

کوئی فساد دَور میں جس کے نہ خلفشار
امن اور عافیت کا فرشتہ کہیں جسے

آئین کا ہو ناز، قوانین کا وہ فخر
شعر و ادب کا حُسنِ دلآرا کہیں جسے

بسملؔ سوائے حضرتِ گوپی کرشن کے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

جنابِ گوپی کرشن اروڑہ، آئی، اے، ایس
ڈپٹی کمشنر ـــــ دہلی

شیرازۂ سخن

"اوراقِ زندگی" میرے کلام کا چوتھا مجموعہ ہے ـــــ اور جن حالات میں اسیر ہوں اُنھیں دیکھتے ہوئے تو پہلے مجموعے کو بھی آخری سمجھ رہا تھا "مشاہدات" کے دیباچے میں میں نے لکھا تھا کہ میں سانس بھی دوسروں کے پھیپھڑوں سے لینا چاہتا ہوں۔ اب کچھ اس سے بھی آگے کی منزل میں ہوں:

دیکھ کر بسمل تمھاری زندگی آیا خیال
زندگی کا موت بھی اک نام ہونا چاہیے

یہ مجموعہ ایک عرصے کے بعد طباعت کے مرحلے میں آیا ہے۔ کتابت ہوئے کئی سال ہو چکے تھے، "تماشائے اہلِ کرم" دیکھ رہا تھا اور اس کی اشاعت سے مایوس ہو گیا تھا۔ یہ بالکل خدا ساز بات ہے کہ ایک مشاعرے میں جناب گوپی کرشن اروڑہ ڈپٹی کمشنر دہلی سے شرفِ نیاز حاصل ہوا میرے کلام کی قدر افزائی فرمائی۔ موصوف نے اور اُن کے ایما سے جناب عبدالاحد صاحب خواجہ (اے ڈی ایم) اور جناب ایس ایل اروڑہ (ایس ڈی ایم) نے ان اوراقِ پریشاں کی شیرازہ بندی کا سر و سامان فراہم کر دیا۔ میں تو اپنے ان محسنوں کا شکر گزار ہوں ہی لیکن ان اوراق سے اگر کسی کو انبساط اور مسرت حاصل ہو تو اُسے بھی اردو زبان اور شاعری کے ان قدر دانوں کا سپاس گزار ہونا چاہیے۔

محترم خواجہ صاحب ایک اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ اور دلی کی سماجی زندگی کی ایک ممتاز شخصیت ہیں، علم پروری کی خاندانی روایت کے امین اور خود ایک ذی مرتبت عالم۔ نجابتِ نسبی اور اصابتِ علمی کا امتزاج قدرتی طور پر صالح صلاحیتوں کی نشو و نما کا سبب بنتا ہے۔ موصوف ایک ذمّہ دار عدالتی حاکم کے منصبی فرائض کو خوش اسلوبی سے نباہتے ہوئے اپنی علم دوست نظر اور اپنے ادب شناس مزاج کے باعث اس مشہور مقولے کے مرجع و مصداق ہیں ـــــ وائے بر جانِ سخن گر بہ سخنداں نرسد۔ اور اس کی شہادت دے رہے ہیں میری زندگی کے یہ اوراق جن پر آپ کی قدر افزائی کی مہریں جا بجا ثبت ہیں۔

محترم اروڑہ صاحب کی ذاتِ گرامی کو قدرت نے اپنی پوری فیاضی کے ساتھ جواہرِ صفاتِ انسانی سے مرصع کیا ہے۔ بڑے منصف مزاج اور نہایت رحمدل حاکم۔ حسنِ صورت، حسنِ سیرت کا آئینہ دار۔ ذی علم اور علم دوست، شعروادب کے سچے دلدادہ و قدرداں اور یہی دلدادگی و قدردانی آپ کی تصویر کی صورت میں "اوراق زندگی" کی زیب وزینت کی موجب اور عزت افزائی کی ضامن ہے۔

محترم حکیم عبدالحمید صاحب (متولی ہمدرد دواخانہ دہلی) اور محترم کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی نوازشوں نے بھی ان اوراق کو سمیٹنے کا حوصلہ دیا ہے۔ اُن کے کرم کا بھی شکرگزار ہوں۔

عزیزی مخمور سعیدی نے جمع و ترتیب اور طباعت و اشاعت کی ذمہ داری قبول کرلی خدا انھیں جزائے خیر دے۔

بسمل سعیدی

دہلی: ۱۵ر نومبر ۱۹۷۰ء

جناب عبدالاحمد صاحب خواجہ (اے، ڈی، ایم)
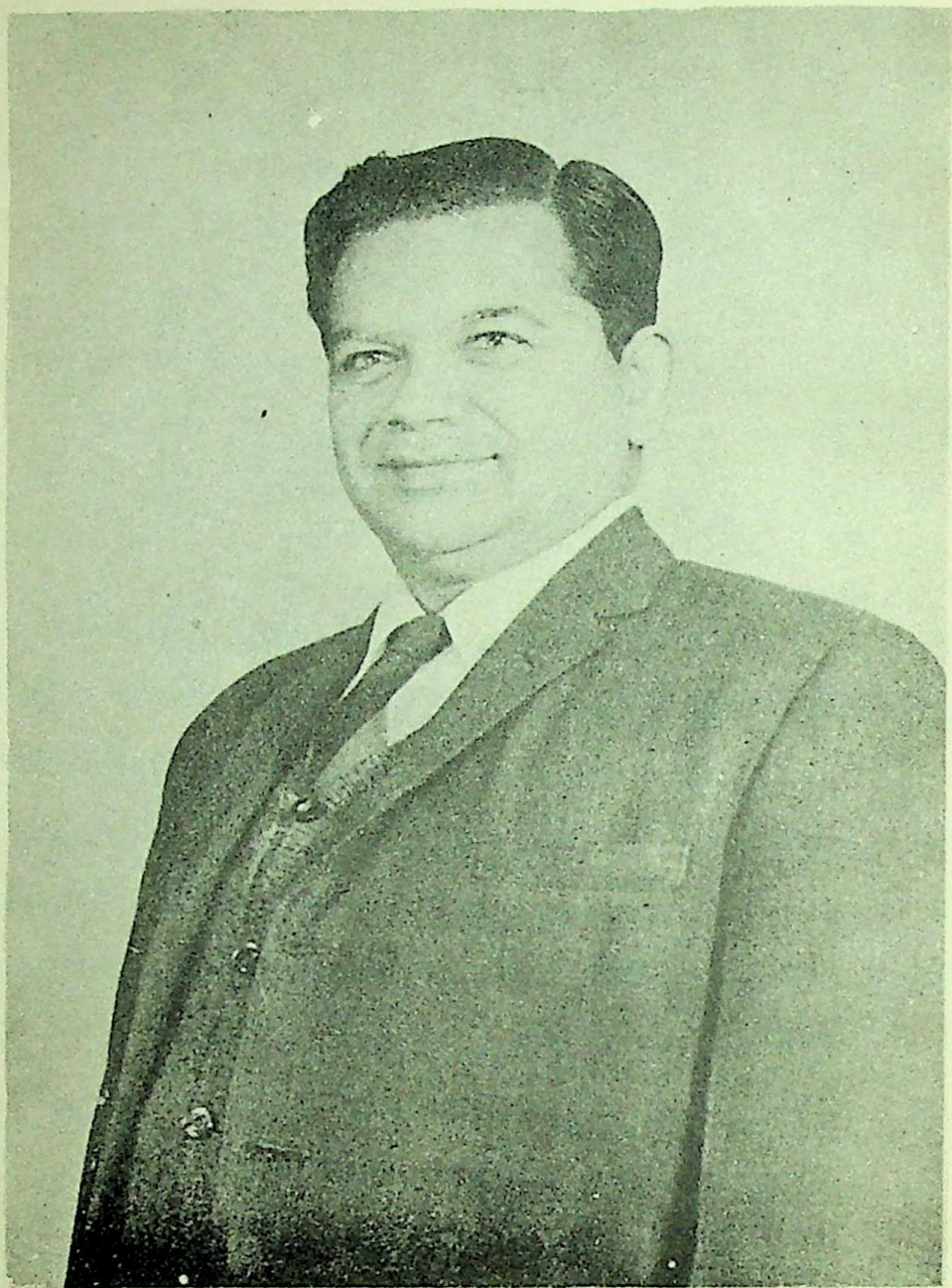
جنابِ ایس، ایل اروڑہ (ایس، ڈی، ایم)

پیش لفظ

غزل اُردو شاعری کا بہترین سرمایہ ہے۔ اِس کے علامتی بیان میں زندگی کا حسن، ہر لطافت اور احساسات کی لطیف ترین پرچھائیاں ملتی ہیں۔ اردو میں جہاں میرؔ و سوداؔ، غالبؔ و مومنؔ، اقبالؔ و چکبستؔ اور حسرتؔ جیسے قد آور شعرا ہوئے ہیں وہاں آج بھی ایسے سخنور موجود ہیں جنھوں نے قدیم استادوں کے آب و رنگ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اردو شاعری کو نئی آواز، نیا درد اور نئی لطافتیں بخشی ہیں۔ اُن میں ایک ذات یقیناً جناب بسملؔ سعیدی کی ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ اُن کا چوتھا مجموعۂ کلام "اوراقِ زندگی" منظرِ عام پر آ رہا ہے۔ بسملؔ صاحب کے اشعار شدّتِ احساس اور حسنِ بیان کے ساتھ کیف و تاثیر کی ایک دنیا ہوتے ہیں۔ میں خود اُن کے کلام کا گرویدہ ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میری طرح لاکھوں انسان اُن کی شاعری سے مسرت حاصل کرتے ہیں۔

یہ میرے لیے فخر و مسرت کی بات ہے کہ بسملؔ سعیدی صاحب نے اس کا انتساب میرے نام کر دیا ہے، یہ اُن کی محبت اور شرافت کی دلیل ہے ورنہ میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا مگر اُن کی خوشی میں خوش ہوں۔

میں بسملؔ صاحب کی زندگی اور اُن کے فن کی مزید قبولیت کے لئے خدا سے دعا کرتا ہوں۔

گوپی کرشن اروڑہ

دہلی: ۲۵۔ نومبر ۱۹۷۰ء

عرضِ مرتّب

بسملؔ صاحب کے کلام کا یہ چوتھا مجموعہ ہے اس سے پہلے ان کے کلام کے تین مجموعے : "نشاطِ غم"
"کیفِ الم" اور "مشاہدات" زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں لیکن اب یہ مجموعے نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ اس
صورتِ حال کے پیشِ نظر بسملؔ صاحب کے بعض قریبی دوستوں، مدّاحوں اور معتقدوں کے ذہن میں پچھلے دنوں
یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ ان تینوں مجموعوں کے انتخاب پر مشتمل بسملؔ صاحب کا ایک نیا مجموعہ مرتّب کر دیا جائے جس
میں وہ کلام بھی شامل ہو جو ان مجموعوں کی اشاعت کے بعد کہا گیا ہے۔ "اوراقِ زندگی" کی ترتیب و اشاعت اسی
خیال کا عملی اظہار ہے۔

ہم لوگوں کی خواہش یہ تھی کہ بسملؔ صاحب اپنے کلام کا انتخاب خود کریں تاکہ اس کی نمائندہ حیثیت زیادہ
سے زیادہ معتبر ہو سکے۔ لیکن آخر میں قرعۂ فال میرے نام پڑا۔ میرے لئے اس فریضے کی ادائیگی جس قدر مسرت بخش تھی اسی قدر
دشوار بھی۔ میرے نزدیک ان کا سارا کلام ہی ایک مجموعۂ انتخاب سے کم نہ تھا اور میرے لئے یہ واقعی بڑا مشکل مرحلہ تھا کہ میں
اُن کے کلام کو ردّ و قبول کی میزان میں رکھوں۔ اگر اس مشکل کام کی انجام دہی میں خود بسملؔ صاحب کی حوصلہ بخش راہ نمائی اور
برادرِ محترم رشید حسن خاں کے مخلصانہ مشورے، مجھے نہ ملتے تو شاید میں اس ذمہ داری سے خاطر خواہ عہدہ برآ نہ ہو سکتا
میں بسملؔ صاحب کے لطف و کرم کا بھی رہینِ منت ہوں اور برادرِ موصوف کے پُرخلوص و پرتپاک تعاون کا بھی سپاس گزار ہوں۔

مجھے بسملؔ صاحب کو اتنے قریب سے اور اس قدر زیادہ دیکھنے کے مواقع میسّر آئے ہیں کہ میں اُن کی شخصیت
یا شاعری پر کسی نظم و ترتیب کے ساتھ کچھ کہنا چاہوں تو حرفِ آغاز ہی ڈھونڈتا رہ جاتا ہوں۔ ویسے ان کی شاعرانہ شخصیت
اور رتبے کو اب کسی تعارف کی ضرورت بھی نہیں۔ ان کی شاعرانہ شہرت کا زمانہ کم و بیش چالیس سال کی مدت کو محیط ہے شاعری
کے سنجیدہ قارئین اور نقاد اُن کے شاعرانہ کمال کے معترف بھی ہیں اور مدّاح بھی۔ پھر بھی کچھ باتیں ایسی ہیں جن کا ذکر
یہاں بے محل نہیں بلکہ مناسب ہوگا۔

بسملؔ صاحب کا سالِ پیدائش ۱۹۰۱ء ہے۔ وہ ریاست ٹونک کے ایک ممتاز و معزز علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔
ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہی حاصل کی۔ شاعری کا ذوق انہیں اپنے جدّ امجد مولوی حکیم سیّد احمد علی صاحب سیمابؔ اور اپنے
والدِ بزرگوار مولانا حکیم سید سعید احمد صاحب اسعدؔ سے ورثے میں ملا۔ اسعدؔ صاحب ایک شفیق باپ بھی تھے ، اور

مہربان اُستاد بھی۔ انھوں نے ہونہار بیٹے کے فطری جوہر اور خداداد صلاحیت کو جلد ہی محسوس کر لیا اور اپنے فیضِ تربیت سے اُسے مزید تاب و توانائی بخشی۔ اس وقت شہر کی عام مجلسی زندگی میں ہر طرف علم و ادب کے چرچے تھے۔ یہاں ایک جملۂ معترضہ کے طور پر مختصراً اس حقیقت کی نشان دہی بھی بے محل نہ ہوگی کہ ہندوستان کی ۱۸۵۷ء کی پہلی قومی بغاوت کی ناکامی کے بعد جب دلّی اور لکھنؤ کے ادبی مراکز انتشار کی نذر ہوئے تو رامپور اور حیدر آباد کی ریاستوں کی طرح ریاست ٹونک بھی جو اس وقت نئی نئی ہی قائم ہوئی تھی، ایک ایسی ریاست تھی جس نے پریشان روزگار اہلِ علم کی فراخ دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ پذیرائی کی۔ علم دوست اور ادب نواز ریاستی حکمرانوں کی طرف سے قدر دانی اور قدر افزائی کی شہرت نے دُور دُور کے اہلِ کمال کے لئے اس چھوٹی سی جگہ کو پرکشش بنا دیا اور وہ کشاں کشاں اس کی طرف آتے رہے۔ اس طرح یہ ریاست اپنے زمانۂ تاسیس ہی سے علم و ادب کا گہوارہ بن گئی اور جیسے جیسے وقت گزرتا رہا اس کی یہ روایت بھی آگے بڑھتی گئی۔ نواب محمد ابراہیم علی خاں اور اُن کے جانشین نواب محمد سعادت علی خاں کے عہد میں یہ روایت اپنے عروج کو جا پہنچی اور خود ٹونک کی سرزمین نے بڑے بڑے اہلِ کمال پیدا کئے۔ یہ دونوں فرمانروا دیگر علوم و فنون کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری کے بھی شائق اور دل دادہ تھے اور خود بھی شعر کہتے تھے۔ اُن کے اثر سے حکمراں خاندان کے دوسرے افراد میں بھی شعر و سخن کا ذوق و شوق خوب پھول پھل رہا تھا۔ بسمل صاحب نے اوّل الذکر نواب کا آخری زمانہ اور مؤخر الذکر کا پورا عہد دیکھا ہے اور ان کی محفلوں کی رونق بڑھائی ہے، اس طرح ان کی شاعرانہ شخصیت کی تشکیل میں اُن کے اپنے گھر کے علمی ادبی ماحول کے ساتھ ساتھ شہر کی اس عمومی فضا کا بھی ضرور کچھ دخل رہا ہو گا جس میں ہر طرف علم و فن کے تذکرے تھے اور شعر و ادب کی زمزمہ سنجیاں۔ بسمل صاحب حصولِ تعلیم کے سلسلے میں کچھ مدّت رامپور بھی رہے اُن کے اخاذ ذہن نے وہاں کی علمی و ادبی فضا کا اثر بھی ضرور قبول کیا ہو گا۔

ریاستی اور جاگیرداری سماج میں بہت سی خرابیاں تھیں لیکن اس کی چند خوبیوں سے بھی انکار مشکل ہے اس سماج کی ایک نمایاں خوبی اس کے ذہین افراد کا یہ اخلاقی وصف تھا کہ وہ اپنے اپنے شعبۂ کارکردگی میں انتہائی ذمہ دار، مخلص اور ایثار شعار ہوتے تھے۔ جب کسی شخص نے اپنے لئے کسی ایک پیشے یا کسی ایک فن کا انتخاب کر لیا تو پھر بیگانۂ مصلحت ہو کر اسی کے منطقی تقاضوں کی تعمیل و تکمیل کو اپنی زندگی کا اوّل و آخر مقصد قرار دے لیا۔ نئے زمانے کے لوگ اسے جنون کا نام دے سکتے ہیں۔ لیکن در اصل یہ ایک طرح کا ذہنی جہاد تھا جس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بڑی سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ یہ آزمائشیں کتنی سخت ہوتی تھیں اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ خود اسی زمانے میں بھی اہلِ فن کے اس عقیدۂ ترکِ ماسوا کے لئے جنون و خبط جیسی اصطلاحات ہی وضع کی گئیں تھیں لیکن اس وقت معاشرے میں اس کے لئے ایک خاص قسم کا احترام اور تپاک پایا جاتا تھا جو اہلِ فن کا حوصلہ بڑھاتا تھا اور وہ اور بھی زیادہ سرگرمی اور لگن کے ساتھ تکمیلِ فن کی مہم سر کرنے میں منہمک ہو جاتے تھے۔ اہلِ فن کی وضعِ جنوں کا یہ احترام اب باقی نہیں رہا ہے۔

بسمل صاحب جاگیرداری دور کے قصیدہ خواں نہیں، اس کے برعکس انھوں نے اپنی شاعری میں اُس

نظام کے بدنما مظاہر پر انگشت نمائی کی ہے اور انہیں ہدفِ ملامت بنایا ہے (غزلوں کے متفرق اشعار سے قطع نظر نظموں میں "سرکار خفا ہیں" "ڈپارٹمنٹل انکوائری" "کاشتکار" "جنازہ" اور بعض دوسری نظموں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے، جو اُن کے پچھلے مجموعوں میں شامل ہیں "سرکار خفا ہیں" اس انتخاب میں بھی لی گئی ہے) عملی زندگی میں بھی اُنہوں نے کئی بار ارضی خداوندوں کی مخالفت کا خطرہ مول لیا لیکن اپنے معجزۂ فن کی نمود میں اُنہوں نے جو خونِ جگر صرف کیا ہے اور جس وضعِ جنوں کی پاسداری میں اپنی شاعری کو تکمیلِ فن کے مراحل سے گزارا ہے وہ غالباً اسی معاشرے کے مثبت پہلوؤں سے اُن کی آگاہی اور باخبری کا نتیجہ ہے جس کے منفی پہلو خود ان کی شاعری میں بھی ہدفِ ملامت بنے ہیں۔ اُن کے فکر و خیال میں جو شائستگی اور رچاؤ ہے اظہار و بیان میں جو نزاکت و نفاست ہے، لفظوں کی دروبست میں جو سلیقہ اور رکھ رکھاؤ ہے، لہجے میں جو ثقاہت اور سنجیدگی ہے وہ اس تہذیبی فضا کی یاد تازہ کر دیتی ہے جس میں اُن سے پہلے ہمارے بعض بہترین غزل گو شعراء کے دل نواز نغمے گونجتے رہے ہیں۔

بسمل صاحب ایک اُستادِ فن بھی ہیں اور ایک حسّاس شاعر بھی ان کی شاعری قدیم و جدید کے امتزاج کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے، ان کے کلام میں جتنی پختگی ہے، اتنی ہی شگفتگی اور تازگی بھی ہے۔ انہوں نے مسلّمہ فنی معیاروں کا احترام ہر جگہ ملحوظ رکھا ہے لیکن وہ رسمیت کے شکار نہیں ہوئے۔ اُن کے آہنگ میں اُردو شاعری کی کلاسیکی روایات کی گونج بھی ہے اور ان کے اپنے جذبات و احساسات کی نغمہ آفرینی بھی۔ موجودہ دَور میں معدودے چند شاعروں کو چھوڑ کر اعتدال و توازن کی ایسی کامیاب مثال مشکل ہی سے نظر آئے گی۔

بسمل صاحب نے غزل نظم اور رباعی تین اصنافِ سخن کو اپنے وسیلۂ اظہار کے طور پر قبول کیا ہے اور تینوں اصناف میں اپنی قادرالکلامی اور فنّی مہارت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ فن کے خارجی لوازم کے اعتبار سے اُن کی نظمیں اور رباعیاں بھی اسی اہمیت اور قدر و قیمت کی حامل ہیں جس اہمیت اور قدر و قیمت کی حامل ان کی غزلیں ہیں، پھر نظمیں خواہ رومانی انداز کی ہوں خواہ مسائلی نوعیت کی، وہ دونوں سے یکساں کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتے ہیں، رومانی نظموں میں جو اس مجموعے میں شامل ہیں، "عرضِ بیداری" "سیاہ ساڑی" اور "خیر مقدم" اپنے اپنے موضوع پر اپنی مثال آپ ہیں۔ "عرضِ بیداری" کے موضوع کا اچھوتا پن بھی قابلِ لحاظ ہے۔ ماحولی حقیقتوں کی ترجمان نظموں میں بسمل صاحب کی نظم "حورِ حرم" اُردو کی پہلی نظم ہے جس میں ہمارے معاشرے کے متوسط طبقے کی متاہلانہ زندگی کی ایسی جزرسی اور واقعیت پسندی کے ساتھ عکاسی کی گئی ہے جس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔

رباعیوں سے بسمل صاحب نے دوراز کار فلسفیانہ موشگافیوں کی بجائے اخلاقی رموز و نکات کی وضاحت کا کام لیا ہے۔ لفظ اخلاق کا اطلاق یہاں قدرے وسیع مفہوم میں ہوگا کیونکہ بسمل صاحب کی رباعیاں اخلاقی مفہوم کی حامل ہوتے ہوئے بھی واعظانہ خطابت سے کوسوں دُور ہیں بلکہ اپنی اکثر رباعیوں میں اُنہوں نے تنگ نظر واعظوں اور کوتاہ بیں فقیہوں کی عام روش کو ہدفِ تنقید بھی بنایا ہے۔ بے عمل علمیت اور منافقانہ دینداری جس میں تصوّف کے جھوٹے مظاہر بھی شامل ہیں، ان کی رباعیوں کا خاص موضوع ہیں اور اُن کے مذموم اثرات کو انہوں نے اپنی متعدد رباعیوں

میں، بڑی جرأت سے بے نقاب کیا ہے۔

لیکن وہ صنفِ سخن جس میں بسمل صاحب کی داخلی شخصیت کا بھرپور اظہار ہوا ہے اور جس کے آئینے میں اُن کے فکروفن کے انفرادی خط وخال اپنی پوری آب وتاب سے جلوہ نما ہوئے ہیں، غزل ہی ہے۔ ان کا ایک مقطع ہے ؎

جس شخص کی بسمؔل سے ملاقات ہوئی ہے   وہ شخص محبت کے پیمبر سے ملا ہے

اور محبت کے اِس پیمبر پر جو صحیفۂ الہام نازل ہوا ہے وہ غزل کی زبان میں ہے۔

بسمل صاحب نے اپنی غزل سے محبت کی پیمبری ہی کا کام لیا ہے اور اس کے ذریعے انہیں واردات وکیفیات کی ترجمانی کی ہے جو فرشتۂ محبت نے ان کے دل ودماغ پر وارد کی ہیں۔ محبت بظاہر ایک عامۃ الورود انسانی جذبہ ہے اور ہر شخص حسبِ ظرف اس کی پذیرائی پر مجبور بھی ہے اور مامور بھی۔ لیکن اس کا فیضان جتنا عام ہے اس کا عرفان اتنا ہی مشکل اور اسی نسبت سے کمیاب ہے۔ بسمل صاحب کے ہاں یہ لفظ اپنے محدود مفہوم سے گزر کر ایک مستقل ذہنی رویّے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس لفظ نے پھیل کر ان کے تمام مشاہدات ومحسوسات کو اپنے آغوش میں سمیٹ لیا ہے ان کے ہاں زندگی کے مختلف مظاہر، مختلف عالم۔ رنج وراحت، غم ونشاط، بیم ورجا، اُمید ویاس، محبّت ہی کی گوناگوں کیفیتوں کے پرتو ہیں۔ محبّت ہی ان کے ہر کام کو مشکل بناتی ہے اور محبت ہی کے فیضان سے وہ اپنی ہر مشکل کو آسان کرتے ہیں۔ وہ زمانے کے پیچ وخم میں ہر قدم پر محبّت کی روشنی محسوس کرتے ہیں اور اسی کی راہ نمائی میں اپنے ذہنی سفر کی منزلیں طے کرتے نظر آتے ہیں۔ محبّت کبھی کبھی انہیں ایک ایسی بلندی پر پہنچا دیتی ہے جہاں احساسِ زمان ومکاں کے ساتھ ساتھ خود اپنے وجود کا احساس بھی دھندلانے لگتا ہے ؎

میں نے دیکھا ہے اُن کی محفل میں   کچھ زمان ومکاں نہیں ہوتا

عشق رکھتا ہے جس جگہ دل کو   میں بھی اکثر وہاں نہیں ہوتا

کسی جذبے کی یہ وہ معراج ہے جہاں بہت سی مسلّمہ حقیقتیں، بہت سے معروف تصوّرات اپنے مروّجہ معنی ومفہوم سے تجاوز کر جاتے ہیں یا ایک بالکل نئی معنویت حاصل کر لیتے ہیں۔ غم وجہ نشاط بن جاتا ہے۔ مایوسی اُمید کا پیام لے کر آتی ہے۔ درد خود ہی درماں کا بدل ہو جاتا ہے اور مفروضات ومسلّمات کی یہ قلبِ ماہیت، انہیں ایک وسیع تر مفہوم یا ایک بالکل نئی معنویت بخشنے کا یہ عمل ہی وہ تخلیقی عمل ہے جو کسی شاعر کی انفرادیت کا ضامن بھی ہوتا ہے اور وسیلۂ اظہار بھی۔ بسمؔل صاحب کی غزل میں قدم قدم پر اس عمل نے اپنا جادو جگایا ہے۔

بسمؔل صاحب کے ذخیرۂ الفاظ میں جو لفظ سب سے زیادہ نمایاں علامتی حیثیت کے حامل ہیں وہ غالباً غم اور محبّت کے لفظ ہیں جو اُن کے ہاں باہم مترادف بھی ہیں۔ یہ الفاظ ان کی پوری شاعری میں بالعموم اور غزل میں بالخصوص جن جن مقامات پر استعمال ہوئے ہیں اُنہوں نے ایک ایسی معنوی فضا کی تخلیق کی ہے جس کے قریب پہنچ کر قاری کو اُن کے منفرد طرزِ فکر اور اُن کے داخلی احساسات سے خاطر خواہ آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ اشعار کے حوالے دے کر اس معنوی فضا کی تشریح وتوضیح یہاں غیر ضروری ہے۔ قارئین آئندہ اوراق کے مطالعے سے خود اس فضا کو اپنے اندر جاگتا محسوس کریں گے اور دیکھیں گے کہ بسمؔل صاحب نے کیسے کیسے لطیف ونازک احساسات کو کیسا کیسا لطیف ونازک پیرایۂ اظہار بخشا ہے۔

مخمور سعیدی

دہلی، ۹-۹-۹۵

پس نوشت

مندرجۂ بالا سطور لگ بھگ ساڑھے پانچ سال پہلے لکھی گئی تھیں، انہی دنوں اس کتاب کو شایع ہونا تھا لیکن بعض وجوہ سے اس کی اشاعت معرض التوا میں پڑتی گئی ـــــ اس دوران میں بسملؔ صاحب ایک بڑے ہی جانکاہ صدمے سے دوچار ہوئے اور اس عمر میں انھیں جوان بیٹی کی دائمی مفارقت کا غم اٹھانا پڑا اور وہ بھی ایسے قیامت آثار حالات میں جو قابلِ بیاں نہیں۔ اس حادثۂ سخت پر خون کے جو آنسو، شعر بن کر ان کی آنکھوں سے نہیں، ان کے دل سے نکلے ہیں، انھیں بھی اب ان اوراق کے دامن میں ایک جداگانہ سرخی کے ساتھ جگہ دے دی گئی ہے۔ "آبشارِ اشک" کے زیرِ عنوان جتنی چیزیں درج ہیں وہ اسی حادثے کی المناکی کا شعری اظہار ہیں اور اس غم کی شدّت اور بے پناہی کو ظاہر کرتی ہیں جو بسملؔ صاحب کے لیے آج بھی تازہ ہے اور آج کے بعد بھی کبھی پرانا نہیں ہوگا ـــــ ان کے اختیار میں اس کے سوا اور کیا تھا کہ دل سے امڈتے ہوئے سیلِ غم کا رُخ آنکھوں سے نوکِ قلم کی طرف پھیر دیں۔

غزلوں کے حصّے میں وہ سب غزلیں بڑھا دی گئی ہیں جو بسملؔ صاحب نے ان چند برسوں میں کہی ہیں۔ ان کا انتخاب ضروری نہیں سمجھا گیا ہے۔ کچھ نظموں کا بھی اضافہ ہوگیا ہے جو ممتاز قومی شخصیتوں سے بسملؔ صاحب کے قلبی لگاؤ یا قومی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں سے ان کی دلچسپی ظاہر کرتی ہیں۔ اس طرح یہ مجموعہ جو انشاءاللہ جلد ہی آپ کے ہاتھوں میں ہوگا، اس مجموعے سے زیادہ ضخیم اور جامع ہوگیا ہے جو اوّلاً میں نے مرتب کیا تھا۔

دہلی، ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء — مخمور سعیدی

غزلیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِؕ

غمِ عشقِ محمدؐ میں کوئی دیکھے فنا ہوکر
اَجل ہنستی ہوئی آتی ہے پیغامِ بقا ہوکر

گرے ہیں جو غمِ اُمّت میں مژگانِ مُطہّر سے
وہ آنسو حشر میں برسیں گے رحمت کی گھٹا ہوکر

مدینے کی زمیں پر لذّتِ سجدہ کوئی دیکھے
کہ فرض اِک سجدہ کردیتا ہے ہر سجدہ ادا ہوکر

ضرورت دیکھ کر یک سُوئی کی ذہنِ مُقدّس کو
اُتر آیا زمیں پر لامکاں غارِ حِرا ہوکر

حصولِ تازگی کے واسطے ہر صبح کو بسمل
ہَوائے خُلد آتی ہے مَدینے میں صبا ہوکر

شبِ تاریک میں پیدا سحر کرنا بھی آتا ہے
ہمیں داغِ جگر کو جلوہ گر کرنا بھی آتا ہے

بدل جاتی ہیں جب ہم سے نگاہیں شادمانی کی
ہمیں ناشادمانی میں بسر کرنا بھی آتا ہے

زمانہ چھین لیتا ہے جب ایوانِ طرب ہم سے
ہمیں غم خانوں میں رہ کر گزر کرنا بھی آتا ہے

طرب کی شاہ راہیں بند ہو جاتی ہیں جب ہم پر
سرِ راہِ الم چل کر سفر کرنا بھی آتا ہے

غبارِ کارواں بر سر ہیں راہوں میں مگر ہم کو
غرورِ ہمرہاں کو پَے سپر کرنا بھی آتا ہے

بچاتے ہیں نگاہیں خاک کے ذرّوں سے بھی لیکن
ہمیں افلاک پر نقد و نظر کرنا بھی آتا ہے

ہم اِک عمرِ خضر ہر آن ضائع کر چکے لیکن
ہمیں ہر آن کو عمرِ خضر کرنا بھی آتا ہے

ہمارا ہر ہُنر اک عیب ہو کر رہ گیا لیکن
ہمیں ہر عیب کو اپنے ہُنر کرنا بھی آتا ہے

جو دن کٹتے نہیں تقدیر کے زیرِ اثر ہم سے
اُنہیں تدبیر کے زیرِ اثر کرنا بھی آتا ہے

سجودِ بندگی کی ناپذیرائی کی غیرت سے
جبینِ شوق کو بیزارِ در کرنا بھی آتا ہے

غرورِ چارہ گر جب درد کی حد سے گزر جائے
ہمیں اِطلاقِ درماں درد پر کرنا بھی آتا ہے

ابھی جنسِ ہُنر ہے منفعل جس نقدِ دولت سے
اُسے شرمندۂ جنسِ ہنر کرنا بھی آتا ہے

زمانے کے بلند و پست کے نرغے میں ہیں لیکن
زمانے کو ہمیں زیر و زبر کرنا بھی آتا ہے

نظر کو ٹھوکروں میں رکھنے والو جلوہ گاہوں میں
ہمیں جلووں کو پامالِ نظر کرنا بھی آتا ہے

مِلا کر اپنی قسمت کے ستارے خاک میں بسمل
ہمیں ذرّوں کو خورشید و قمر کرنا بھی آتا ہے

گزر کے عشق کی حد سے بھی کچھ یہ عالم ہے
کہ جیسے عشق ابھی اُن کے حسن سے کم ہے

عَدو کا گھر ہے تِری راہ میں تو کیا غم ہے
سُنا ہے خُلد کے رستے میں بھی جہنم ہے

غلط ہے یہ کہ مزاجِ زمانہ برہم ہے
زمانہ کیا ہے تمہاری نظر کا عالم ہے

یہ وقت کل نہ رہے گا رہیں گے یاد یہ دن
سِتم کی عمر زیادہ ہے زِندگی کم ہے

وہ اپنے ظلم سے خود بھی نہ رہ سکے محفوظ
جبیں پر آج نہ بل ہے نہ زلف میں خم ہے

اِک اِضطرابِ مسلسل کو عِشق کہتے ہیں
وہ اِضطراب کہ اِک آرزوئے پیہم ہے

خوشا یہ آتشِ عِشق، آدمی کا ذکر تو کیا
فرشتے جلتے ہیں جس میں یہ وہ جہنم ہے

نہ ہو جو عِشق تو سوگندِ زندگی بھی فضول
جو عشق ہو تو ہر اک سانس عہدِ مُحکم ہے

حریمِ ناز تک اُن کے ہزار عالم ہیں
حریمِ ناز تو پھر عالموں کا عالم ہے

بہار کیا ہے، چمن کی اک آرزوئے طرب
خزاں، چمن کی اُسی آرزو کا ماتم ہے

عبادتوں کے لئے فُرصتیں ہیں لوگوں کو
ہمیں گُناہ بھی کرنے کو زِندگی کم ہے

زِہے یہ وقت کہ بسملؔ بقول ناظمؔ کے
اب آفتاب سے اُونچا مقامِ شبنم ہے

ناظمؔ سنبھلی مرحوم

مری بے رہروی کو رہبرِ کامل نہیں ملتا
کوئی مستغنیٔ رسم و رہِ منزل نہیں ملتا

سفینہ بھی ہے بحرِ عشق میں ساحل بھی ہے لیکن
سفینہ جس کو ملتا ہے اُسے ساحل نہیں ملتا

ترے در پر ز ہے شرمندۂ دریوزگی ہونا
دو عالم میں دماغِ نخوتِ سائل نہیں ملتا

خدا جانے تری محفل کا عالم بھی کہاں تک ہے
کوئی دنیا میں دور افتادہ محفل نہیں ملتا

عبث احباب کو شکوہ ہے تسکینِ دل نہ ملنے کا
ملے گا کیا کسی سے، اب ہمیں سے دل نہیں ملتا

عِشق میں کوئی زماں اور نہ مکاں ہوتا ہے
وہ دو عالم سے الگ ایک جہاں ہوتا ہے

کِس قدر اُن کی طبیعت پہ گراں ہوتا ہے
جِس فسانے میں وفاؤں کا بیاں ہوتا ہے

شدّتِ شوق کا اللہ رے فسوں اُف رے فریب
اُن کی نفرت پہ محبّت کا گُماں ہوتا ہے

صِرف اک دل ہی وہ معبد ہے وہ اِک معبدِ عشق
جس میں ناقوس ہم آوازِ اذاں ہوتا ہے

اُن سے اِس طرح جُدا ہو کے ہم آئے ہیں کہ ہائے
آنکھ سے جیسے کوئی اشک رواں ہوتا ہے

حُسن کے حق سے کوئی عُہدہ برآ کیا ہوگا
عِشق کا حق بھی ادا ہم سے کہاں ہوتا ہے

اپنی سوزش میں بھی ہوتا ہے جہنّم محسوس
غیرِ کی آگ کا شعلہ بھی دھواں ہوتا ہے

سُننے والے ہی پہ ہے منحصر اندازۂ غم
ورنہ جو حال ہے وہ کس سے بیاں ہوتا ہے

غیرِ کی آگ میں جلنے کا مزہ ہے کچھ اَور
ورنہ پروانہ بھی خود شعلہ بجاں ہوتا ہے

ہائے اِس عِشق میں انساں کا جواں مرجانا
جیسے کم بخت اِسی دن کو جواں ہوتا ہے

ساتھ ہر سانس کے آتا ہے زباں پر ترا نام
دل میں جو کچھ ہو وہی وردِ زباں ہوتا ہے

جِس جنازے پہ برستی ہوئی حسرت دیکھوں
اُس جنازے پہ مجھے اپنا گُماں ہوتا ہے

عِشق میں ہائے طبیعت کا وہ عالمَ تبسّل
عَالمِ عِشق بھی جب دل پہ گراں ہوتا ہے

جب کبھی دیر و حرم ٹکرائے میخانوں کے ساتھ
صَرفِ گردش کر دیا ساقی نے پیمانوں کے ساتھ
حُسن بھی کم بخت کب خالی ہے سوزِ عشق سے
شمع بھی تو رات بھر جلتی ہے پروانوں کے ساتھ
روز میخواروں کی قسمت کے سِتارے شام سے
جگمگا اُٹھتے ہیں جاگ اُٹھتے ہیں میخانوں کے ساتھ
گردشِ گردوں خللِ اندازِ میخانہ ہو کیا
وقت رہتا ہے یہاں گردش میں پیمانوں کے ساتھ
عقل اپنوں سے بھی اکثر بچ کے چلتی ہے ذرا
عشق ہی کم بخت ہو جاتا ہے بیگانوں کے ساتھ
کس قدر خوش فہم تھے جو لوگ اگلے وقت میں
مسجدیں بنوا دیا کرتے تھے بُت خانوں کے ساتھ
تا نباشد چیز کے مردم نہ گوید چیز ہا
کچھ حقیقت بھی ہوا کرتی ہے افسانوں کے ساتھ
منفعل کرتا ہے بسملؔ وہ جنوں کو عقل سے
کوئی فرزانہ جو ہو جاتا ہے دیوانوں کے ساتھ

رسم ورواجِ دہر میں کیا یہ بڑی کمی نہیں
ماتمِ مرگ ہے مگر ماتمِ زندگی نہیں
ہے یہ دلوں کی تیرگی رات کی تیرگی نہیں
لاکھ چراغ ہیں مگر بزم میں روشنی نہیں
ایک یہ تیری بزمِ عیش ایک وہ غم کدے جہاں
شمع کی روشنی تو کیا چاند کی چاندنی نہیں
کہتے ہیں جس کو ہم خوشی سب کی خوشی کا نام ہے
میری خوشی خوشی نہیں تیری خوشی خوشی نہیں
بسملؔ اب اور کس طرح رسمِ وفا نباہیے
اُن سے تو دوستی سہی خود سے تو دشمنی نہیں

اگر دل ہو شوقِ فراواں کے بس میں
محبّت کو تبدیل کر دے ہوس میں

خوشا عالمِ رنگ و شادابیٔ حُسن
شرابور ہو جیسے پھولوں کے رس میں

زہے عالمِ شرم و شوق اُس نظر کا
کوئی راہ رَو جس طرح پیش و پس میں

کہاں دستِ شرق اور کہاں ان کا دامن
بظاہر مگر جیسے ہو دسترس میں

جوانی کا عالم ہے کچھ ہی نفس کا
مگر ایک عالم ہے ایک اِک نفس میں

مرا کارواں منزلِ مرگ میں ہے
کوئی صور پھونکو صدائے جرس میں

اُدھر لرزہ اندازِ افلاک اِنساں
اِدھر جُنبشِ چشم و ابرو کے بس میں

بہاریں جو دن ساتھ لائی ہیں بسمِلؔ
یہ دن بھی گزار آئیں چل کر قفس میں

دل غمِ عشق کی امانت ہے
دِل میں اپنی خوشی، خیانت ہے
مجھ سے عہدِ وفا وہ کیوں چاہیں
حُسن خود عشق کی ضمانت ہے
عقل بیداریِ شعور ہے صِرف
عشق اِنسان کی ذہانت ہے
نگہِ لُطفِ حسن کا مقصد
غیرتِ عشق کی اہانت ہے
زندگی کو سنبھال کر رکھئے
زندگی موت کی امانت ہے
ترکِ دُنیا فریب ہے لیکن
یہ بھی اِک وضعِ اِستعانت ہے

چھپ کے نظروں سے مری دل میں جو پنہاں ہوں گے
ایک دن وہ مری نظروں سے نمایاں ہوں گے

اس جہنم میں ابھی خُلد بہ داماں ہوں گے
ابھی دنیا میں ہزاروں ترے خواہاں ہوں گے

تیرے اندازِ تبسم، یہ نشاطِ محفل
کسی کم بخت کے دل میں غمِ پنہاں ہوں گے

کس قدر حوصلہ افزائے نظر ہیں جلوے
جتنا دیکھو اُنہیں اُتنے ہی نمایاں ہوں گے

چشمِ مشتاق! کہاں گرتی ہے سجدے میں ابھی
وہ ابھی اور ابھی اور نمایاں ہوں گے

اب تو اِس درد کو میں دل سے نہ جانے دوں گا
اب اگر وہ کبھی مرے درد کا درماں ہوں گے

دیکھئے حشر میں کیوں کر ہو مکافاتِ عمل
مُجھ پہ ہوں گے جو ستم غیر پر احساں ہوں گے

لذّتِ جور کوئی غیر کے دل سے پُوچھے
ہائے وہ ظلم جو در پردہ احساں ہوں گے

وعدہ کرتے ہیں کس اندازِ پشیمانی سے
کوئی سمجھے کہ ابھی اور پشیماں ہوں گے

میں سمجھتا تھا مرے دردِ محبّت کی قسم
آپ اِک روز مرے درد کا درماں ہوں گے

ہے ابھی وقت بہ ہر حال میں زندہ ہوں ابھی
جان دے دوں گا اگر آپ پشیماں ہوں گے

ہیں وہ دشمن کے تو ہیں عشرتِ دشمن بن کر
میرے ہوں گے تو مرا حالِ پریشاں ہوں گے

جب کسی بات پہ چاہیں وہ پشیماں ہونا
ایک اِک کر کے سب اندازِ پشیماں ہوں گے

میرے ارمانوں پہ جلتے ہیں جو صورت سے مری
اُن کی صورت سے نمایاں مرے ارماں ہوں گے

اُن کا در چھوڑ کے او ننگِ محبت، او رشک
ارے کم بخت یہ سجدے جو پریشاں ہوں گے

زندگی عشق کی ہے صرف جوانی بسملؔ
پھر نہ ہم ہوں گے نہ دل ہوگا نہ ارماں ہوں گے

اگر اب کرم اُن کے ہم پر نہیں ہیں
تو ہم بھی اب اُن کے کرم پر نہیں ہیں

ہم اپنی امیدوں پہ زندہ ہیں اب تک
تمہارے تو قول و قسم پر نہیں ہیں

میں اندازِ چشمِ کرم دیکھتا ہوں
نِگاہیں مِری بیش و کم پر نہیں ہیں

پڑے ہیں درِ حُسن پر ٹھوکروں میں
وہ سجدے جو فرشِ حرم پر نہیں ہیں

وہ میری وفاؤں پہ عائد ہوئے ہیں
جو الزام اُن کے سِتم پر نہیں ہیں

ہمیں اپنا غم ہے خوشی سے زیادہ
زمانے کے زر غمے تو غم پر نہیں ہیں

زمانے میں رہ کر بھی ہم لوگ بسمل
زمانے کے رحم و کرم پر نہیں ہیں

وہ نظر ہی اصل میں ہے نظر جو نظر ہے جلوۂ یار پر
نہ وہ دیر کے در و بام پر نہ حرم کے نقش و نگار پر
جو نظر کہ نزہتِ گل پہ ہے وہ نظر ہے زحمتِ خار پر
کہ سوادِ شامِ خزاں بھی تو ہے فروغِ صبحِ بہار پر
رہ و رسمِ منزلِ عشق اب ہے تمام اُن کے شعار پر
جو نہ چل سکے کبھی دو قدم بھی وفا کی راہگزار پر
وہ کریں جو معذرتِ ستم تو خوشا نصیب زہے کرم
نہ بھلا سکیں گے مگر وہ ہم جو گزر گئی دلِ زار پر
یہ مری جبینِ حیات پر مری سر نوشتِ ازل نہیں
یہ وہ کتبۂ غمِ مرگ ہے جو لکھا ہو لوحِ مزار پر
جو ہوائیں کیفِ نفس نفس تو فضائیں رنگِ نظر نظر
ترا حُسن ہے یہ شباب پر کہ بہشت اپنی بہار پر
مری زندگی ہی کا بوجھ کچھ نہیں بسکہ ارضِ وطن پہ کم
مری موت کا تو خدا کرے نہ ہو بار خاکِ دیار پر

وہی ہوتی ہے رہبر جو تمنا دل میں ہوتی ہے
بقدرِ ہمتِ رہرو کشش منزل میں ہوتی ہے

بہت ہوتی ہے یوں تو عشق کی توقیر دُنیا میں
مگر اتنی نہیں جتنی تری محفل میں ہوتی ہے

محبّت، اے معاذاللہ محبّت، دم نکل جائے
اگر محسوس بھی اتنی ہو جتنی دل میں ہوتی ہے

ٹھہرنے بھی نہیں دیتی ہے اس محفل میں بیتابی
مگر تسکین بھی جا کر اُسی محفل میں ہوتی ہے

پرستش کر، محبت کرنے والوں کی پرستش کر
خدا ہوتا ہے دل میں جب محبّت دل میں ہوتی ہے

مرا کیا ساتھ دیں گے غیر بحرِ عشق میں بسملؔ
وہ اُس کشتی میں ہیں جو دامنِ ساحل میں ہوتی ہے

اثر اندوزِ دو عالم نہیں ہونے پاتی　　تیری محفل کبھی برہم نہیں ہونے پاتی

وسعتیں عشق کی محدود ہوئی جاتی ہیں　　آرزو ہے کہ ابھی کم نہیں ہونے پاتی

اپنے احساسِ مسرت کو بھی کھو دیتی ہے　　جب محبّت سببِ غم نہیں ہونے پاتی

مل گیا رنگ بھی تخلیق میں تیری ورنہ　　صرف نکہت تو مجسّم نہیں ہونے پاتی

اللہ اللہ رے محبّت کا وہ عالم کہ یہ جب　　کوئی ٹھہرا ہُوا عالم نہیں ہونے پاتی

تم سے آنسو بھی مرے اب نہیں پونچھے جاتے　　جذب خورشید سے شبنم نہیں ہونے پاتی

صدمۂ ہجر سے کم بخت نہ گزُرے جب تک　　آرزو وصل کی محکم نہیں ہونے پاتی

ہائے بے ربطیٔ انفاسِ محبّت بسملؔ
آہ کم بخت بھی ہمدم نہیں ہونے پاتی

کب سے اُلجھ رہے ہیں دمِ واپسیں سے ہم
دو اشک پونچھنے کو تری آستیں سے ہم

ہوگا تمہارا نام ہی عنوانِ ہر ورق
اوراقِ زندگی کو اُلٹ دیں کہیں سے ہم

سنگِ درِ عدو پہ ہماری جبیں نہیں
یہ سجدے کر رہے ہیں تمہاری جبیں سے ہم

دُہرائی جا سکے گی نہ اَب داستانِ عشق
کچھ وہ کہیں سے بھول گئے ہیں کہیں سے ہم

بسملؔ حریمِ حسن میں ہیں کامیابِ شوق
جوشِ شباب و رنگِ رخِ آتشیں سے ہم

کیا زیست تباہ ہو گئی ہے — ہر سانس اِک آہ ہو گئی ہے
تاریک ترے بغیر دنیا — تا حدِّ نگاہ ہو گئی ہے
اب ہجر کی رات چاندنی سے — کچھ اَور سیاہ ہو گئی ہے
اُٹھتی ہی نہیں کسی طرف اب — مایوس نگاہ ہو گئی ہے
تھی اُن سے جو رسمِ گاہ و بے گاہ — اب گاہ بہ گاہ ہو گئی ہے
کیا چیز ہے بندگی کہ اکثر — طاعت بھی گناہ ہو گئی ہے
اِن وقت کے ساتھیوں سے اپنی — کِس طرح نباہ ہو گئی ہے
خالی ہی گرا ہو بام سے طشت — دُنیا تو گواہ ہو گئی ہے
موت آئی ہے مرگِ عشق ہو کر — آپ اپنی پناہ ہو گئی ہے
اے وقت نہ پوچھ تیرے ہاتھوں — کیا چیز تباہ ہو گئی ہے
جاتی تھی کبھی جو دل سے دل تک — مسدود وہ راہ ہو گئی ہے
سرسبز وہ کشتِ شوق اپنی — بے برگ و گیاہ ہو گئی ہے
پڑتے ہی جبینِ وقت پر بَل — کج اپنی کُلاہ ہو گئی ہے
غیروں سے نباہ کرنے والو — اپنوں سے نباہ ہو گئی ہے

بربادیٔ دل کے ساتھ بسملؔ
دُنیا ہی تباہ ہو گئی ہے

جب وہ در پردۂ اسرار نظر آتے ہیں
کس قدر مختلف انوار نظر آتے ہیں

وائے بیدادِ جنوں، دشت میں دیوانے کو
ہر طرف کچھ در و دیوار نظر آتے ہیں

کل تو غم خوار بھی اغیار نظر آتے تھے
آج اغیار بھی غم خوار نظر آتے ہیں

مجھ سے بدبختیٔ ادراکِ غمِ عشق نہ پوچھ
صبح سے شام کے آثار نظر آتے ہیں

عرصۂ حشر میں مجبورِ مشیّت بسمل
کتنے معصوم گنہگار نظر آتے ہیں

فراہم جس قدر عشرت کے ساماں ہوتے جاتے ہیں
سکونِ رُوح سے محروم انساں ہوتے جاتے ہیں

کبھی طرزِ تغافل تھے ۔ یہی اندازِ محبوبی
جوابِ حرفِ نوازشہائے پنہاں ہوتے جاتے ہیں

جبیں قدموں سے اُن کے اُٹھتی جاتی ہے دمِ رخصت
سجودِ شوق آنسو بن کے قرباں ہوتے جاتے ہیں

شباب و حسنِ روز افزوں کا اُن کے کچھ یہ عالم ہے
کہ ہم شرمندۂ شوقِ فراواں ہوتے جاتے ہیں

سرِ بالینِ بیمارِ محبّت وہ دمِ آخر
تسلّی دیتے جاتے ہیں پریشاں ہوتے جاتے ہیں

ق

ابھی جامِ مئے رنگیں لبِ لعلیں تک آیا ہے
مگر آنکھوں میں میخانے سے غلطاں ہوتے جاتے ہیں

فضائے خلد پر جیسے گھٹائیں چھائے جاتی ہوں
رُخِ گل رنگ پر گیسو پریشاں ہوتے جاتے ہیں

ق

ہمیں اب ٹونک میں رہ رہ کے دلّی یاد آتی ہے
شب و روزِ وطن شامِ غریباں ہوتے جاتے ہیں

نفس کی آمد و شُد کا یہ عالم ہے جُدائی میں
کہ نشتر جیسے پیوستِ رگِ جاں ہوتے جاتے ہیں

تعالی اللہ فیضِ باغباں بسملؔ تعالی اللہ
خس و خاشاکِ گلشن گل بداماں ہوتے جاتے ہیں

پر توِ حُسن ایک ہے اور آئینہ خانے بہت
اِک حقیقت نے بنا ڈالے ہیں افسانے بہت

رخصت اے چاکِ گریباں دستِ وحشت الوداع
بڑھ چُکے ہیں اب جنوں کی حد سے دیوانے بہت

کھو نہ جائیں کثرتِ اصنام میں وحدت پرست
بندگی کے ذہن میں ہوتے ہیں بُت خانے بہت

شمعِ تُربت پر مری آتے ہوئے جلتے ہیں پَر
شمعِ محفل پر تو آجاتے تھے پروانے بہت

بسملؔ اِس دِلّی کے اِن سُنسان ویرانوں میں آہ
گونجتے ہیں آج بھی عبرت کے افسانے بہت

محکومِ مشیت آدمی ہے — ہر معصیت ایک بندگی ہے
مدبھی کوئی انتظار کی ہے — اب چاندنی دھوپ ہو چلی ہے

ق

کیا دیر و حرم کو بدظنی ہے — میخانے کی بات اور ہی ہے
کچھ مصلحتاً نگاہِ ساقی — رندوں کے خلاف ہو گئی ہے

کیوں کر رہے عشق بے تمنّا — خود حسن کا مقتضا یہی ہے
ہم بے خبرِ عدم نہیں صرف — ہستی بھی فریبِ آگہی ہے
اللہ ری ظُلمتِ شبِ غم — تاروں کی سیاہ روشنی ہے
اب حُسن سے بھی ہے عِشق بیزار — دیوانے کی کس سے دوستی ہے
کیفیتِ عشق اَب تو شاید — کچھ عِشق کی حد سے بڑھ گئی ہے
ہے میری محبّت اُن کو معلوم — محسوس ابھی نہیں ہوئی ہے
اللہ رے تری جفا کے انداز — سانچے میں وفا کے ڈھل گئی ہے
دِل اُس سے سوا ہے آرزو مند — جتنا اُسے آنکھ دیکھتی ہے
غنچہ دہنی تو کوئی دیکھے — آواز میں اِک شگفتگی ہے
معصومیِ حُسن پر بھی کم بخت — یک عِشق و ہزار بدظنی ہے
یاد اُن کی ہے دل میں اب بھی لیکن — آواز سی ایک دُور کی ہے
بُت خانے میں بن رہی ہے دنیا — مسجد میں قیامت آ رہی ہے

جذبات نہ ہوں تو شاعری کیا
جذبات کا نام شاعری ہے

رہروِ راہِ محبت کون سی منزل میں ہے — دل ہے بیزارِ محبت، اور محبت دل میں ہے

جستجو کا اک بہانہ، شوقِ منزل، دل میں ہے — ننگِ ذوقِ جستجو ہے جو قدم منزل میں ہے

کیا زباں پر ہے کسی کی، کیا کسی کے دل میں ہے — جس کی محفل ہے وہی جانے وہ جس مشکل میں ہے

کاروانِ حسن و عشق اب تک کہیں ٹھہرا نہیں — قیس ابھی صحرا میں ہے، لیلیٰ ابھی محمل میں ہے

ہو چکے مقتل تو سب دارالاماں میں منتقل — پھر یہ اب کس کا جنازہ کوچۂ قاتل میں ہے

کیا ترا دستِ کرم ہے ایک مٹھی کے سوا — تیری مٹھی سے زیادہ کاسۂ سائل میں ہے

عشرتِ رفتہ کا رونا کیا غمِ امروز میں — عیشِ فردا بھی وہ ماضی ہے جو مستقبل میں ہے

دل وہ کیا دل ہے جسے محسوس ہو اپنا ہی درد — دل تو وہ ہے دوسروں کا درد بھی جس دل میں ہے

اس کی کثرت پر فدا میں، اس کی وحدت پر نثار — جس کسی کے دل میں ہے گویا اسی کے دل میں ہے

چاہتے ہیں تم سے بھی سُن لیں جوابِ عرضِ شوق — ورنہ ہم خود جانتے ہیں جو تمھارے دل میں ہے

ہم کہاں ہیں اب تری محفل میں، لیکن آج تک — تیری محفل دل میں ہے یا دل تری محفل میں ہے

رنگِ محفل میں نظر آتا ہے اک رنگِ دگر — تیری محفل کے سوا بھی کچھ تری محفل میں ہے

ہمسفر کچھ دن رہے، لیکن خدا جانے کہ اب — عشق ہے کس مرحلے میں، حسن کس منزل میں ہے

چھانتے ہیں خاک اس منزل کی اہلِ جستجو — آج میرے کارواں کی گرد جس منزل میں ہے

منزلِ مقصود بسملؔ وہ نظر آنے لگی
ہر نظر منزل پہ جیسے ہر قدم منزل میں ہے

اِس زندگی کو عشرتِ امروز چاہیئے مجھ سے تو روز وعدۂ فردا کرے کوئی
رہنے کو بے نیازِ تمنّا رہا کریں لیکن وہ چاہتے ہیں تمنّا کرے کوئی
جب ماورائے عشق و تمنا ہو ذوقِ دل کم بخت فرطِ شوق میں پھر کیا کرے کوئی
اب حُسنِ خود نما میں سمایا ہوا ہے عشق اب چشمِ خود نگر سے بھی پردہ کرے کوئی
توفیقِ حُسن گر نہ ہو جرأت فزائے عشق کس کی مجال ہے کہ تمنّا کرے کوئی
میرے جنونِ شوق پہ سب کی نگاہ ہے اُن کے جمال کو بھی تو دیکھا کرے کوئی
مُجھ سے تو پوچھتا ہے ہر اک میرے حال کو اُن کی نگاہ سے بھی تو پوچھا کرے کوئی
رہ رہ کے اب وہ آپ جھجکتے ہیں اس طرح جیسے کسی کو دیکھ کے پردہ کرے کوئی

بسمل غرورِ حسن بھی ہے نازِ حُسن سے
میری طرف بھی کاش نہ دیکھا کرے کوئی

سر جس پہ نہ جُھک جائیں اُسے در نہیں کہتے
ہر در پہ جو جُھک جائے اُسے سر نہیں کہتے

کعبے میں مسلمان کو کہہ دیتے ہیں کافر
بُت خانے میں کافر کو بھی کافر نہیں کہتے

رِندوں کو ڈرا سکتے ہیں کیا حضرتِ واعظ
جو کہتے ہیں اللہ سے ڈر کر نہیں کہتے

کعبے ہی میں ہر سجدے کو کہتے ہیں عبادت
میخانے میں ہر جام کو ساغر نہیں کہتے

ہر بار نئے شوق سے ہے عرضِ تمنّا
سَو بار بھی ہم کہہ کے مکرّر نہیں کہتے

میخانے کے اندر بھی وہ کہتے نہیں میخوار
جو بات کہ میخانے کے باہر نہیں کہتے

کہتے ہیں محبّت فقط اُس حال کو بسمل
جس حال کو ہم اُن سے بھی اکثر نہیں کہتے

مجھے اب فکرِ دل کی ہے نہ اب اندیشۂ جاں ہے
محبّت ، اپنی اس منزل سے خود میری نگہباں ہے

شعاعِ مہر میں رنگینیاں جیسے بہاروں کی
کسی کے حُسن کا عالم ہے یا صُبحِ گلستاں ہے

بہی جاتی ہو جیسے رُوح فرطِ شادمانی سے
الٰہی چشمِ گریاں آج کِس کے زیرِ داماں ہے

وہی اِک حُسن ہے حُسنِ شباب اور حسنِ صورت میں
کہیں سے کچھ نمایاں ہے کہیں سے کچھ فروزاں ہے

بنا کر بھیجتی ہیں جنّتیں پھولوں کے پروانے
یہ کس کے حُسن سے روشن مِری شمعِ شبستاں ہے

نسیمِ صبح سے مُنہ پھیر کر یہ مُسکراتے ہیں
گلوں میں کس کا اندازِ تبسّم ہائے پنہاں ہے

قبولِ اِعتبارِ حُسن اگر ہو جائے تو بسمل
محبّت ایک وعدہ ہے تمنّا ایک پیماں ہے

جو دکھائے اُن کا حسنِ کار فرما دیکھئے
صُبحِ حسرت دیکھئے شامِ تمنّا دیکھئے

دیکھ کر گلگشت اک مستِ خرامِ نازکی
ساغرِ گُل رنگ میں کیا موجِ صہبا دیکھئے

قدِّ آدم ہو کے جیسے رہ گیا ہو آفتاب
اِک سراپا حُسن کا حُسنِ سراپا دیکھئے

حسرتِ جلوہ بقدرِ حاصلِ نظّارہ ہے
اُتنی ہی بڑھتی ہے حسرت اُن کو جتنا دیکھئے

دست و دامن میں نہ ہو جیسے کوئی وابستگی
میرے دستِ شوق سے دامن چھڑانا دیکھئے

فرض ہی پابندیِ آئینِ میخانہ سہی
بسملؔ اوّل چشمِ ساقی کا اشارہ دیکھئے

ترے لئے جو سرِ رہگذار بیٹھے ہیں
فگندہ خاک بہ سر، تاجدار بیٹھے ہیں

وہ بے نیاز تو مستغنیٔ کرم ہیں ہم
وہ اور ہوں گے جو اُمّید وار بیٹھے ہیں

نہ التفات کی خواہش نہ بے رُخی کا ملال
ہم ان کی بزم میں بیگانہ وار بیٹھے ہیں

نظامِ دہر مرتّب یہیں تو ہوتا ہے
یہ میکدہ ہے جہاں بادہ خوار بیٹھے ہیں

جو بُت کدے میں ہے ہلچل تو حشر کعبے میں
ہم اِضطراب میں کس کو پکار بیٹھے ہیں

وہ آکے دیکھ لیں بسملؔ مری وطن گردی
جو خوش نصیب غریب الدیار بیٹھے ہیں

رُلائے جاتے ہیں اور مُسکرائے جاتے ہیں
وہ میرے غم پہ خوشی بن کے چھائے جاتے ہیں
شگفتہ ہیں مِرے گُلہائے آرزو تم سے
یہ پھول خود نہیں کِھلتے کھلائے جاتے ہیں

خُدا ہی جانے کہاں شام ہونے والی ہے
سحر سے آج قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

تِری نظر ہے کہ اندازۂ مشیّت ہے
تِری نظر سے مُقدّر بنائے جاتے ہیں

نہ ہوں نصیب مرے دشمنوں کو بھی وہ دِن
کہ جب خُدا سے گنہ بخشوائے جاتے ہیں

خُدا کے بندے بھی کعبے میں اب نہیں بنتے
صنم کدے میں خدا بھی بنائے جاتے ہیں

ہزار بند درِ مے کدہ سہی بسملؔ
پلانے والے ہمیں تو پلائے جاتے ہیں

ہیں کُشتگانِ دِل کے ٹھکانے کہاں کہاں
بکھرے پڑے ہیں غم کے فسانے کہاں کہاں
تیرِ نگاہِ ناز کی اللہ ری زَدیں
تاکے ہیں ناوکوں نے نشانے کہاں کہاں
خوابیدہ دشت و در کی ہے بیدار خامشی
گونجے ہوئے ہیں تیرے ترانے کہاں کہاں
مل بھی گیا ہو اُن کو پتہ تیرا کیا خبر
پُہنچے ہیں اپنی دُھن میں دِوانے کہاں کہاں
اِس آسماں نے چھین کے ہم سے زمین میں
جانے چھپا دئے ہیں خزانے کہاں کہاں
ہوں گے بھی ختم تیرے مقامات نامُراد
ہم کو لئے پھرے گا زمانے کہاں کہاں
دام آئیں یا نہ آئیں نظر تُو یہ دیکھ لے
بکھرے پڑے ہیں باغ میں دانے کہاں کہاں
بسمل ہزاروں زندۂ جاوید جستجو
پُہنچے ہیں اِس اجل کے بہانے کہاں کہاں

جہاں سے عشق چاہے زندگی آزار ہو جائے
مُسلسل قہقہہ اک آنسوؤں کا تار ہو جائے

کم از کم اس قدر تو آدمی ہشیار ہو جائے
کہ جب دنیا نہ آئے راس تو دیندار ہو جائے

کبھی چھیڑا تو کر مضرابِ غم سے سازِ ہستی کو
نشاطِ زندگی ہے دل اگر بیدار ہو جائے

بہاریں زندگی کی یوں مری قسمت میں لکھی ہیں
کہ میں جس پھول کو دامن میں رکھوں خار ہو جائے

کوئی اس زندگیٔ عشق کی نگرانیاں دیکھے
کہ جب مصروفِ خواب آنکھیں ہوں دل بیدار ہو جائے

کبھی اے آفتاب ایسی بھی کوئی صبح پیدا کر
صدا ناقوس کی سُن کر حرم بیدار ہو جائے

نہ ملنے پائے راحت حُسن کے عشرت کدوں میں بھی
محبّت جب کسی کے درپئے آزار ہو جائے

سمجھتا ہوں تمہارے بے سبب ترکِ جفا کو میں
کہ رُودادِ وفا نا قابلِ اظہار ہو جائے

مقدّر کی خوشی اُس بزم میں لیکن نہ غم کوئی
مگر جس طرح کی جس پر نگاہِ یار ہو جائے

وہ آرزو ، وہ تمنّا ، وہ اضطراب نہیں
میں اب وہاں ہوں جہاں کوئی باریاب نہیں
تری نگاہ کی شوق آفرینیاں، توبہ
جو کامیاب ہے وہ بھی تو کامیاب نہیں
غمِ فراق کی بے کیفیاں خدا کی پناہ
شراب میں بھی تو کیفیّتِ شراب نہیں
مجھے پکار رہے ہیں صنم کدے والے
مری دعائیں جو کعبے میں مستجاب نہیں
جب التفات نہ تھا اشتیاق رہتا تھا
اب التفات ہوا ہے تو دل کو تاب نہیں
وہیں سے اُٹھتے ہیں ہر انقلاب کے بادل
وہ میکدہ کہ جہاں کوئی انقلاب نہیں
بدل گئے ہیں شب و روزِ زندگی بسملؔ
وہ ماہتاب نہیں اب وہ آفتاب نہیں

محبّت رُوح بن کر جب سمائی جسمِ انساں میں
نگاہِ حسن نے پیدا تڑپ کر دی رگِ جاں میں

وہاں کیا مانعِ بیداد قتل احساسِ خجلت ہو
جہاں سو دشنۂ خوں ریز ہوں چشمِ پشیماں میں

تو پھر اے دستِ وحشت پاک کر قصّہ ہی دامن کا
نہ گُل اپنے، گلستاں میں، نہ خار اپنے بیاباں میں

قفس میں جو ہوا کے سرد جھونکے آتے رہتے ہیں
الٰہی کیا بہاریں اب بھی آتی ہیں گلستاں میں

وہ کیوں ہونے لگے لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے وہ بھی شامل ہوں مرے حالِ پریشاں میں

اُلُوہیّت بھی شامل بندگی کا لُطف بھی حاصل
محبّت کا بھی جذبہ، ہائے کیا جذبہ ہے انساں میں

ملیں گی بن کے حوریں خلد میں انسان کو بسمل
جوانی کی وہ راتیں جو گزر جائیں گی ارماں میں

رنگ و بو تک ہی نہیں ہے دورِ دامانِ بہار
خار و خس میں بھی نظر آتی ہے اِک شانِ بہار

اُس کے دل سے پوچھیے انجامِ ارمانِ بہار
جس کے گلشن میں خزاں آئے بہ عنوانِ بہار

فصلِ گُل کو جس قدر برباد کرتی ہے خزاں
باغ میں اُتنا ہی بڑھ جاتا ہے امکانِ بہار

کیوں نہ ہو ناقابلِ برداشت اُسے قیدِ قفس
پرورش پائی ہو جس نے زیرِ دامانِ بہار

بسملؔ اُس بزمِ طرب میں ہوں میں وہ افسردہ گل
فصلِ گُل میں جو رہے محرومِ فیضانِ بہار

کون سمجھے عشق کی دشواریاں
اِک جنوں اور لاکھ ذمّہ داریاں

اہتمامِ زندگیِ عشق دیکھ
روز مر جانے کی ہیں تیّاریاں

عشق کا غم وہ بھی تیرے عشق کا
کون کر سکتا مِری غم خواریاں

بے خودیِ عشق ، جیسے غم کی نیند
غم کی نیندیں روح کی بیداریاں

عشق بھی ہے کس قدر بر خود غلط
اُن کی بزمِ ناز اور خودداریاں

اس محبّت اس جوانی کی قسم
پھر نہ یہ نیندیں نہ یہ بیداریاں

یہ نیازِ آرزو مندی نہ دیکھ
اور کچھ ہیں عشق کی خودداریاں

اختلاجِ قلب کے دَورے نہیں
عِشق کی بسمل ہیں دل آزاریاں

نفس نہیں کوئی ایسا کہ جاں گُداز نہیں
یہ میرا عشق ہے زاہد تری نماز نہیں
ہوس کی زندگیٔ جاوداں پہ لعنت ہے
بلا سے عمرِ محبّت اگر دراز نہیں
تعلقاتِ محبّت کی جان ہوتی ہے
وہ اِک نگاہ بہ ظاہر جو دِل نواز نہیں
اگر کسی کی محبّت میں کوئی راز نہ ہو
تو پھر کسی کی محبّت تو کوئی راز نہیں
نگہ بھی جرم کبھی جرم بے نگاہی بھی
کسی اصول پہ وہ جلوہ گاہِ ناز نہیں
میں بے نیاز سہی تم سے بھی محبّت ہیں
مگر تمہاری محبّت سے بے نیاز نہیں
تم اپنے حسن کی کھا کر قسم مُکر جاؤ
اگر تمہاری محبّت کو مجھ پہ ناز نہیں
سُنائی دیتی ہے محسوسِ جان و دل ہو کر
وہ اِک صدا جو ہنوز آشنائے ساز نہیں
دو بارہ کس سے ملی عشق کی نگاہِ گرم
زمانہ سوز ہے بسمل زمانہ ساز نہیں

اپنے دامن سے مرے پونچھنے والے آنسو
دامنِ خاک سے اب آکے اٹھالے آنسو

باغ میں آج تری یاد میں رونے کے لئے
میں نے پھولوں کے تبسّم سے نکالے آنسو

کتنی آنکھوں پہ ہیں احسان ترے دامن کے
میری آنکھوں کے بھی دامن میں چھپالے آنسو

میری آنکھوں سے تم اب اپنی امانت لے لو
بدنصیبوں کے کوئی پونچھ نہ ڈالے آنسو

جام بھر بھر کے نہ دے ہجر میں ساقی مجھ کو
نظر آتے ہیں یہ لبریز پیالے آنسو

پھر خدا جانے رہے ان میں روانی نہ رہے
چشمِ خوں بار ابھی اور بہالے آنسو

اب یہ کم بخت کریں کس کے حوالے بسمل
کر دئے دل نے تو آنکھوں کے حوالے آنسو

محبّت تم سے بے اندیشۂ جاں کر رہا ہوں میں
تمہاری ہی محبّت کو نگہباں کر رہا ہوں میں
محبّت ہی مرے ہر کام کو مشکل بناتی ہے
محبت ہی سے ہر مشکل کو آساں کر رہا ہوں میں
نہ ہونا لائقِ زندانِ ہستی ، امرِ دیگر ہے
مگر پابندیِ آئینِ زنداں کر رہا ہوں میں
دل اُن کا ، جان ان کی عشق ان کا آرزو اُن کی
مگر با ایں ہمہ کچھ ان پہ قرباں کر رہا ہوں میں
جب آنکھیں اُٹھ گئیں دیکھا کہ ہے کچھ اَور ہی عالم
عجب نظّارۂ حسنِ فراواں کر رہا ہوں میں
محبّت سے کہیں اُس کا تحمّل ہی نہ ہو بسمل
محبّت کے بھروسے پر جو ارماں کر رہا ہوں میں

نگاہِ عشق جو مانوسِ دلبری نہ رہی
جہانِ حسن میں رسمِ ستم گری نہ رہی

فریبِ سادگیٔ چشمِ حسن ارے توبہ
کہ اب نگاہ میں جیسے فسوں گری نہ رہی

کیا ہے عشق نے جس دن سے حسن کو سجدہ
زمیں پہ عرش کو اس دن سے برتری نہ رہی

نہ جانے خودرویٔ عشق کس جگہ لے آئی
کہ گمرہی مری محتاجِ رہبری نہ رہی

نیازِ عشق پہ تھی منحصر نوازشِ حسن
وہ بندگی نہ رہی، بندہ پروری نہ رہی

ہوس کی دُنیا میں رہنے والوں کو میں محبّت سکھا رہا ہوں

جہاں پہ دامن بچھے ہوئے ہیں وہاں پر آنکھیں بچھا رہا ہوں

سرودِ غم پر بھی زندگی میں طرب کے دھارے بہا رہا ہوں

میں اُن کے سازِ جفا پر اپنی وفا کے نغمے سُنا رہا ہوں

الٰہی دنیا میں اور کچھ دن ابھی قیامت نہ آنے پائے

ترے بنائے ہوئے بشر کو ابھی میں انساں بنا رہا ہوں

انھیں سے شاداب جنّتوں کی فضاؤں میں لحنِ سرمدی ہے

یہ اشکِ غم جو سکوتِ شب ہائے زندگی میں بہا رہا ہوں

عدم کے تاریک راستے میں کوئی مسافر نہ راہ بھُولے

میں شمعِ ہستی بُجھا کر اپنی چراغِ تُربت جلا رہا ہوں

ملی ہے کانٹوں کی مجھ کو قسمت مگر ہے پھولوں کی میری فطرت

جہاں ہوں پامالِ غم ہوں لیکن جہاں بھی ہوں مسکرا رہا ہوں

چلا ہے شوقِ سجود لے کر الٰہی یہ کس کے در کی جانب

ابھی تو پہلا قدم اُٹھا ہے ابھی سے میں سر جھکا رہا ہوں

تری نظر کیا میں اپنے دل سے بھی گر کے جاتا ہوں انجمن سے

جہاں کہ ہوتی ہے ختم دُوری وہاں سے بھی دُور جا رہا ہوں

یہ کس کے کوچے میں گامزن ہوں یہ آستاں کس کا سامنے ہے

میں اپنے قدموں پر آج بسمل سرِ دو عالم جھکا رہا ہوں

ہر بلند و پست کو اِس طرح ٹھکراتا ہوں میں
کوئی یہ سمجھے کہ جیسے ٹھوکریں کھاتا ہوں میں

ایک سنّاٹا سا چھا جاتا ہے قلب و روح پر
ہائے وہ عالم، مجھے جب یاد آجاتا ہوں میں

کون جانے یا میں جانوں یا مری تنہائیاں
جانے کیا کہہ کر دلِ مضطر کو سمجھاتا ہوں میں

دیکھ سکتا ہی نہیں اوّل تو میں اُن کی طرف
دیکھ لیتا ہوں تو پھر دیکھے چلا جاتا ہوں میں

ہائے وہ محویّتِ ذوقِ تصوّر ہجر میں
جب نفس کی آمد و شُد سے بھی گھبراتا ہوں میں

حسن آخر حسن ہے اور عشق آخر عشق ہے
وہ کہیں ملتے نہیں اور ہر جگہ پاتا ہوں میں

فکرِ انجامِ محبّت ، عالمِ تنہائی میں
جیسے اپنے آپ میں ڈوبا چلا جاتا ہوں میں

جب وہ ہوتے ہیں تو ہر شے جیسے ہو جاتی ہے گُم
وہ نہیں ہوتے تو ہر شے میں اُنہیں پاتا ہوں میں

موت سے بچ کر کدھر جاؤں میں بسمل کیا کروں
ہر طرف سے کوئے قاتل میں پہنچ جاتا ہوں میں

حُسن کا رنگِ طبیعت مجھے معلوم نہ تھا
نُور ہے پرتوِ ظلمت مجھے معلوم نہ تھا

میں نے آغازِ محبّت کو محبّت سمجھا
مگر انجامِ محبّت مجھے معلوم نہ تھا

تھا مجھے خوفِ شریعت کہ وہ ہے میرے خلاف
میری جانب ہے مشیّت مجھے معلوم نہ تھا

تھی جو اِک شمعِ شبستانِ طرب میں روشن
ہے چراغِ سرِ تربت مجھے معلوم نہ تھا

زِندگی کے لئے بن جائے گی میری ہستی
سانس لیتی ہوئی تربت مجھے معلوم نہ تھا

خدا نے جنّتیں بھر دیں محبّت کی عبادت میں
تمہارا آستاں لکھ کر مرے سجدوں کی قسمت میں

کبھی صبحِ مسرّت میں کبھی شامِ مصیبت میں
سمائے جا رہے ہیں وہ مرے ذوقِ محبّت میں

یہی ہے جُزوِ اعظم تیرے اجزائے محبّت میں
تمنّا کی حفاظت کر محبّت کی حِفاظت میں

جبینِ عقل جس میں جُرأتِ سجدہ نہیں کرتی
گزر جاتا ہے اکثر عشق اُس منزل سے نخوت میں

گوارا ہے محبّت ہو نہ جس اُمّید پر جینا
اُسی اُمّید پر انسان مرتا ہے محبّت میں

ہمیں اُن کی طرح منظور خود بینی نہیں ، ورنہ
محبّت حسن سے بڑھ کر حسیں ہے اپنی فِطرت میں

کسی تصویر میں رنگِ مذاقِ ہر نظر جیسے
یہی عالم قبولِ حسن کا ہے اُن کی صُورت میں

نظر جب حسن آتا ہے کسی منظر میں دنیا کے
اِضافہ ہو کے رہ جاتا ہے وہ تیری محبّت میں

مشیّت تک رہی ہے مُنہ اچنبھے سے شریعت کا
مِری فردِ عمل رکھّی ہے میزانِ قیامت میں

تِری چشمِ عنایت کا بہت ممنون ہوں لیکن
محبّت کی حقارت ہے تری چشمِ عنایت میں

وہ قدِ آدم آئینے میں بسمل اُن کی انگڑائی
جوانی جس طرح بیدار ہوتی ہے طبیعت میں

فریبِ حُسن ہے دُنیا مری نظر کے لئے   نِگاہِ عشق نہیں حسنِ رہ گزر کے لئے

کسی جبیں میں کسی در کے واسطے بھی نہیں   مِری جبیں میں جو سجدے ہیں تیرے در کے لئے

مِری نظر کو جو ترسا رہی تھی اپنے لئے   ترس رہی ہے وہ صورت مِری نظر کے لئے

نہ چارہ گر کے لئے مجھ میں کوئی وصفِ حیات   نہ وجہِ ماتمِ مرگ ، آہ نوحہ گر کے لئے

تمام عمر بھی گزرے جو بن کے ظلمتِ شب   کریں نہ منّتِ خورشید ہم سحر کے لئے

زمانہ آنکھ سے مجھ کو گرا کے بھول گیا   اک اشک تھا میں زمانے کی چشمِ تر کے لئے

قبولیت کو اگر ہیں عبادتیں درکار   گناہ چاہئیں رحمت کو درگزر کے لئے

کیا خیال نہ اپنا بھی کچھ مری خاطر   دُعائیں کی ہیں سِتاروں نے بھی سحر کے لئے

چمن نے پھول دئے اور شفق نے رنگ دیا   شُعاعیں چاند نے دیں تیری رہگزر کے لئے

وہ زندگی ہے محبّت کہ جس کے زیرِ اثر   نفس نفس میں ہو اک موت عمر بھر کے لئے

بلائے عشق سے بسملؔ نہ رکھ اُمّیدِ نجات
دعائے صبح نہ کر شامِ بے سحر کے لئے

دل میں جو دردِ عشق ہے درد نہیں سرور ہے
آنکھ میں اشکِ غم جو ہے اشک نہیں ہے نُور ہے

ذوقِ نظر ہے یا کوئی جلوۂ بے ظہور ہے
محوِ طلسمِ شوق ہوں ، غیب ہے یا حُضور ہے

صبح سے شام دُور ہے ، شام سے صبح دُور ہے
عالمِ صبح و شامِ عشق جیسے کہ بے مُرور ہے

غم سے ہے رُوح بھی حزیں درد سے دل بھی چور ہے
آہ وہ مقصدِ حیات ہائے جواب بھی دُور ہے

جتنا میں اُس سے پاس ہوں اتنا وہ مجھ سے دُور ہے
جتنا مجھے نیاز ہے اتنا اُسے غرور ہے

عقدۂ مرگِ عاشقی کھولتا جا رہا ہے وہ
مسئلۂ حیات پر جتنا جسے عبور ہے

اب دلِ دردمندِ عشق ایک بھی ٹھیس کا نہیں
درد کی کائنات میں سانس نہیں ہے صُور ہے

قلب و نظر میں کیا بنے فرق سا فرق ہے کوئی
عشق میں جو شعور ہے عقل میں وہ فتور ہے

کس سے کہوں نزاکتِ صورتِ حالِ دل کہ اب
عشق بھی دُور دُور ہے حُسن بھی دُور دُور ہے

بسمل اگرچہ اب نہیں فرصتِ کاروبارِ عشق
پائے طلب نہیں مگر ذوقِ طلب ضرور ہے

آتی ہے ہر طرف سے صدائے درا مجھے
کن مرحلوں میں چھوڑ گیا قافلہ مجھے

یا اُن کے دل سے مجھ کو بھلایا نہ جا سکے
یا میرے ذہن سے کبھی بھلا دے خُدا مجھے

یارب جنونِ عشق میں وہ لمحہ اب نہ آئے
محسوس جس میں ہو کہ یہ کیا ہو گیا مجھے

دشمن کی موت کی بھی دعا پر یہ حال ہے
جس طرح کوستے ہوں یہ دستِ دُعا مجھے

اشکوں میں رنگِ حسن ہے آہوں میں بوئے حسن
راس آگئی ہے عشق کی آب و ہوا مجھے

ہنستا رہا میں حال پہ اوروں کے مدّتوں
بسملؔ اب اپنے حال پہ رونا پڑا مجھے

نہیں معلوم پائیں گے سکوں اہلِ جہاں کب تک
خدا جانے رہے گا اِس زمیں پر آسماں کب تک

یہ افسانہ ابھی تو زیرِ عنوانِ کرم بھی ہے
سُنائے جاؤں میں اُن کے ستم کی داستاں کب تک

قفس میں تو مجھے جب تک بھی رہنا ہو مگر یارب
تصوّر میں مرے جلتا رہے گا آشیاں کب تک

غضب ہے ٹھیس لگنا عشق کی خوددار فطرت کو
بس اے چشمِ کرم اب التفاتِ رائگاں کب تک

دلِ مایوس میں کچھ خارِ حسرت سے کھٹکتے ہیں
خُدا جانے رہیں گی راکھ میں چنگاریاں کب تک

نہیں جب پاسِ وعدہ تو مُکر بھی جاؤ گے اک دن
بدل جائے گا جب دل تو نہ بدلے گی زباں کب تک

کبھی اُمّید کی نظروں سے دیکھ اپنی طرف بسمل
نگاہِ یاس سے دیکھے گا سوئے آسماں کب تک

سُنا ہے ایک جہاں اِس جہاں سے پہلے تھا
عجب جہاں تھا اگر آسماں سے پہلے تھا

اگرچہ سجدے ہیں ممنونِ آستاں لیکن
مذاقِ سجدہ مجھے آستاں سے پہلے تھا

تمہیں کہو، کبھی تم نے سُنا تھا خوش ہو کر
تمہارا ذکر جو میرے بیاں سے پہلے تھا

نہ شوقِ رہزنیٔ دل نہ ذوقِ غارتِ جاں
عجب طریق مِرے کارواں سے پہلے تھا

بہار تھی نہ خزاں، برق تھی نہ تھا صیّاد
چمن نہ تھا جو مرے آشیاں سے پہلے تھا

کچھ اس طرح ہے مجھے دردِ عشق کا احساس
یہ جیسے مُجھ کو یونہیں جسم و جاں سے پہلے تھا

زہے وہ بزم کہ ہوتا ہے روز یہ محسوس
کہ جیسے کوئی تعلق یہاں سے پہلے تھا

ہنوز دل میں اُسی شدّ و مدّ سے ہے بسمل
وہ حوصلہ جو مجھے امتحاں سے پہلے تھا

عشق جو ناگہاں نہیں ہوتا
وہ کبھی جاوداں نہیں ہوتا

عشق رکھتا ہے جس جگہ دِل کو
میں بھی اکثر وہاں نہیں ہوتا

مجھ پہ ہوتے ہیں مہرباں جب وہ
خود پہ اپنا گُماں نہیں ہوتا

عشق ہوتا ہے دِل کا اِک عالَم
دل کا عالَم بیاں نہیں ہوتا

میں نے دیکھا ہے اُن کی محفل میں
کچُھ زمان و مکاں نہیں ہوتا

عشق ہوتا ہے دل بہ دل محسوس
یہ فسانہ بیاں نہیں ہوتا

کچُھ یہ حالت ہے لِسمل اب جیسے
باغ میں باغباں نہیں ہوتا

بند ہے درِ شراب خانے کا — حال کھُلتا نہیں زمانے کا

سر ہے اب اور جنونِ سجدہ ہے — ہوش کس کو ہے آستانے کا

بزمِ بیداد میں اُجالا ہے — جانے کس کے سیاہ خانے کا

کھا رہا ہوں میں ٹھوکریں لیکن — ٹھوکروں میں ہے سرِ زمانے کا

برق وقفِ طواف رہتی تھی — کیا زمانہ تھا آشیانے کا

کون ہے جو نہیں زمانے میں — کس سے شکوہ کریں زمانے کا

ہو گیا ہے قفس قفس جس سے — وہ تصوّر ہے آشیانے کا

تم نہ ہوتے اگر زمانے میں — کس سے اُٹھتا ستم زمانے کا

شاید اِس دَور میں نہیں بسملؔ
کارفرما کوئی زمانے کا

حُسن ہر رنگ میں رہتا ہے نمایاں ہوکر
شامِ میخانہ و صبحِ چمنستاں ہوکر

عشقِ گستاخ کی شہ پر ترا خواہاں ہوکر
دِل دھڑکتا ہے لرزتا ہوا ارماں ہوکر

گُل تو گُل خار پہ دیکھی جو کبھی گرم شعاع
چھا گئے باغ پہ ہم ابرِ بہاراں ہوکر

کتنے خورشیدِ حیات اِس اُفقِ ہستی پر
رہ گئے شمعِ سرِ گورِ غریباں ہوکر

اب ترے عشق کی ہو گی نہ حفاظت مجھ سے
اب ترا عشق رہے میرا نگہباں ہوکر

ہو گئے درج فرشتوں کی غلط فہمی سے
تیری رحمت کے تقاضے مرے عصیاں ہوکر

زندگی کفر کی بھی تم سے نہ گزری بسمل
کچھ بھی غیرت ہے تو مر جاؤ مسلماں ہوکر

رودادِ غم کو میری تعلّق بیاں سے کیا
یہ سُن رہے ہو تم مرے اشکِ رواں سے کیا

ہے کیوں ہنوز حوصلۂ امتحاں مجھے
تم مطمئن نہیں ہوا ابھی امتحاں سے کیا

کیا جذب ہو رہا ہوں میں جلووں میں حُسن کے
اب عشق ساتھ چھوڑ رہا ہے یہاں سے کیا

کھوئیں گے دو جہاں کو ہمیں تیرے عشق میں
کھوئے گا تیرا عشق ہمیں دو جہاں سے کیا

کچھ دن نشاطِ شوق کے گُزرے تھے عشق میں
اب مُنفعل ہوں تیرے غمِ جاوداں سے کیا

ہاں تُو نے آستاں سے مجُھے تو اُٹھا دیا
سجدے بھی اُٹھ سکیں گے ترے آستاں سے کیا

اُلجھے سے جا رہے ہیں کچھ انفاسِ زندگی
ٹُوٹے گا سلسلہ یہ کبھی درمیاں سے کیا

واقف نہ تھا میں ترکِ تعلّق سے ہم نشیں!
ہوتی ہے ابتدائے محبّت یہاں سے کیا

بسمؔل ، بیاضِ شعر ہے فردوسِ رنگ و بو
جاری ہے فیض اسعدؔ[1] خلد آشیاں سے کیا

[1] سیّدی و ابی مولوی حکیم سید سعید احمد اسعدؔ ؒ ❊

سپردِ زیست میں پا کر سکونِ زندگی میں نے
اُنہیں کو دے دیا ہے اختیارِ موت بھی میں نے

خدا کی شان ہے اب لن ترانی سُن رہا ہوں میں
ترے جلووں کو بخشی تھی کبھی تابندگی میں نے

کہاں میں اور کہاں تیری محبت اِس طرح لیکن
دیا ہے اپنی ہستی کو فریبِ زندگی میں نے

بایں عجز و نیازِ بندگی بھی کچھ یہ عالم ہے
کہ جیسے آستانِ ناز کی توہین کی میں نے

چمن سے بے تعلق رہ کے بھی دل پر گری بجلی
چمن کی سمت دیکھی برق جب گرتی ہوئی میں نے

کچھ ایسے لوگ محرومِ خوشی دیکھے ہیں دنیا میں
کہ اپنے حق میں غم کر لی ہے اپنی ہر خوشی میں نے

زمانہ ہنس رہا ہے آج بسمل میرے رونے پر
نہ جانے کس کے رونے کی اُڑائی تھی ہنسی میں نے

نئی روز اک اُفتاد ہے اور میں ہوں
زمانے کی بیداد ہے اور میں ہوں

چمن ہے، تری یاد ہے اور میں ہوں
صنوبر ہے شمشاد ہے اور میں ہوں

محبّت کا عالم کبھی کچھ کبھی کچھ
دلِ شاد و ناشاد ہے اور میں ہوں

بس اب زندگی ماتمِ زندگی ہے
غمِ عمرِ برباد ہے اور میں ہوں

تصوّر ہے، افسردہ تنہائیاں ہیں
تری بزم کی یاد ہے اور میں ہوں

مری فردِ عصیاں ہے یہ داورِ حشر!
یہ تعمیلِ ارشاد ہے اور میں ہوں

وہی برق و باراں ہے اور آشیاں ہے
وہی دامِ صیّاد ہے اور میں ہوں

بہار اب گلستاں سے کب جائے دیکھو
خزاں تک کی میعاد ہے اور میں ہوں

مری شاعری خلطِ مبحث نہیں ہے
محبّت کی رُوداد ہے اور میں ہوں

آپ جانا بھی نہیں اُن کو بُلانا بھی نہیں
مگر اِس طرح کچھ آسان بُھلانا بھی نہیں

جو فسانوں کو حقیقت میں بدل دیتے تھے
آج دنیا میں کہیں اُن کا فسانہ بھی نہیں

کیوں نہ بیتی ہوئی باتوں کو بُھلا ہی بیٹھیں
اب وہ ہم تم بھی نہیں اب وہ زمانہ بھی نہیں

تم جب آتے ہو تو جانے کے لئے آتے ہو
اب جو آکر تمہیں جانا ہو تو آنا بھی نہیں

منزلِ قبر تک اسبابِ سفر کیا لینا
پاس جانا ہے کہیں دُور تو جانا بھی نہیں

جس قدر تُو نے رُلایا ہے زمانے مجھ کو
اب کسی اور کو اتنا تو ہنسانا بھی نہیں

کُنجِ تربت کا تصوّر ہے غنیمت بسملؔ
ورنہ دلّی میں کوئی اور ٹھکانا بھی نہیں

آہ کا کیوں اثر نہیں ہوتا
دردِ دل دردِ سر نہیں ہوتا
عشق کو دیکھتا ہے اصل میں وہ
حُسن کچھ خود نگر نہیں ہوتا

سنگ اُس آئینے کو کہتے ہیں
جس میں آئینہ گر نہیں ہوتا
عِشق میں عالَم وِصال تو کیا
ہجر بھی بیشتر نہیں ہوتا

عشق ہے وہ مسلسل ایک دُعا
جِس دُعا میں اثر نہیں ہوتا
آہ ، آوازِ بازگشت نہیں
عشق با ہمدگر نہیں ہوتا

عشق نومید تو نہیں لیکن
عشق اُمّید پر نہیں ہوتا

دل بن سکا نہ درد کو پیدا کئے بغیر
پیدا ہُوا نہ درد تمنّا کئے بغیر

وہ عشق ہے جو دل کو گوارا کبھی نہ ہو
اور دل رہے نہ جس کو گوارا کئے بغیر

کیا ترکِ آرزو بھی نہیں ہے قبولِ حُسن
اُٹھتے ہیں پاؤں اُدھر اب ارادہ کئے بغیر

کافر! خدا کرے کہ وہ تیرا شباب ہو
مرجاؤں جس گناہ سے توبہ کئے بغیر

اے جذبِ عشق دیکھ یہ ہوتا ہے نازِ حُسن
یوں آئے ہیں وہ جیسے اِرادہ کئے بغیر

ہر چند اُن سے کوئی سروکار بھی نہ ہو
بنتی نہیں ہے اُن کی تمنّا کئے بغیر

اللہ رے شرطِ عشق کہ ناکامیوں پہ بھی
بسملؔ رہا نہ جائے تمنّا کئے بغیر

محبت میں کہیں یوں بھی کوئی برباد ہوتا ہے
کہ جو عالم گزر جاتا ہے مجھ کو یاد ہوتا ہے
سکوتِ لب وہاں اِک عالمِ فریاد ہوتا ہے
جہاں کوئی فریبِ لطف سے برباد ہوتا ہے

خرابِ عشق ہونا غایتِ مفہومِ ہستی ہے
وہ دل آباد ہو جاتا ہے جو برباد ہوتا ہے
نہیں ہے شادکامِ آرزو ہونا اگر اُن سے
تو پھر اُن کے تصور سے بھی دل کیوں شاد ہوتا ہے

خدا احساسِ رشکِ غیر کی منزل گزروا دے
یہاں رہ کر مرا ذوقِ وفا برباد ہوتا ہے
جہانِ حُسن میں دل کی پرستش گاہ کچھ بھی ہو
مگر آنکھوں کا اک کعبہ الگ آباد ہوتا ہے

درو دیوارِ زندانِ محبت پر یہ لکھا ہے
یہاں جو قید ہوتا ہے وہ بے میعاد ہوتا ہے
یہ اُن کی بے نیازی ہے کہ وہ سجدوں کو ٹھکرا دیں
کہیں اپنا مذاقِ بندگی برباد ہوتا ہے

جنونِ عشق بسمل اِن خیالوں ہی کو کہتے ہیں
کہ جن سے شادِ فرقت میں دِل ناشاد ہوتا ہے

رہنے کو ہم قفس میں رہے آشیاں سے دُور
لیکن چمن میں تھی یہ جگہ آسماں سے دُور

اُس قُرب سے جو سجدوں میں تجُھ سے ہوا مجُھے
سجدے بھی ہیں مقابلۃً آستاں سے دُور

جتنا بھی آشیاں میں قفس سے قریب تھا
اُتنا ہی اب قفس میں ہوں میں آشیاں سے دُور

تجُھ سے بھی دُور تک کوئی ایسی جگہ نہیں
محفل میں اپنی تُو نظر آئے جہاں سے دُور

اُس نامُراد سے جو ترے آستاں پہ ہے
اچھا ہے بدنصیب جو ہے آستاں سے دُور

اب تک کوئی بتا نہ سکا راہِ عشق میں
منزل کہاں سے پاس ہے بسمل کہاں سے دُور

میں بھی مشکل سے اُٹھا رشک بھی مشکل سے اٹھا
دِل وہیں بیٹھ گیا جب تری محفل سے اُٹھا

تیری محفل کے علاوہ کوئی عالم ہی نہیں
وہ کہیں کا نہ رہا جو تری محفل سے اُٹھا

آپ میں آنے کی پھر کوئی جہت ہی نہ رہی
میں تری بزم سے جب تیرے مقابل سے اُٹھا

عینِ دریا کا تلاطم تو رہا ساحل تک
ہو گیا قہر وہ طوفان جو ساحل سے اُٹھا

ڈگمگاتا تھا اِدھر پائے طلب کا بسمل
شورِ لبیک اُدھر جانبِ منزل سے اُٹھا

پاتے نہیں ہیں عیب کو بھی کم ہنر سے ہم
جب دیکھتے ہیں چشمِ حقیقت نگر سے ہم

اُن کے فریبِ لطف کے دن بھی گزر گئے
اب مطمئن ہیں اپنے غمِ معتبر سے ہم

کتنا بلند عشق کی غیرت نے کر دیا
جس دن سے گر گئے ہیں تمہاری نظر سے ہم

بیٹھیں تو کس اُمید پہ بیٹھے رہیں یہاں
اُٹھیں تو اُٹھ کے جائیں کہاں تیرے در سے ہم

دو دِن میں ہو گیا ہے یہ عالم کہ جس طرح
تیرے ہی اختیار میں ہوں عمر بھر سے ہم

خود جس قدر بلند ہیں اپنی نگاہ میں
اتنے نہ گر سکیں گے تمہاری نظر سے ہم

دیکھیں گے کیا کسی کو اب اپنی نگاہ سے
خود کو بھی دیکھتے ہیں تمہاری نظر سے ہم

بسمل مسافرت کی یہ ساری مصیبتیں
پہلے ہی دل میں سوچ کے نکلے ہیں گھر سے ہم

ہوتی ہے محسوس اک مشکل پسِ مشکل مجھے
یہ نظر آتا ہے شاید اپنا مستقبل مجھے

چھوڑ دے اے اِنتہائے عشق کی منزل مجھے
عشق ہے درکار ان کے حُسن کے قابل مجھے

ہے وہی میری تمناؤں کا ذمہ دار بھی
جس نے ان کو حسن دے کر دیدیا ہے دل مجھے

ہائے مجبوریِ عشق و وائے تابِ رشکِ غیر
وہ سمجھتے ہیں شریکِ عشرتِ محفل مجھے

حال ہے یا ماورائے حال کچھ کھُلتا نہیں
جانے کس عالَم میں رکھتی ہے تری محفل مجھے

اللہ اللہ بے پناہی جستجوئے شوق کی
اور اِک منزل بتاتی ہے ہر منزل مجھے

آج تک جاری ہے تکمیلِ کرم کا سِلسلہ
غم دیا جاتا ہے بسمل بر بنائے دِل مجھے

کب تک رہے خبر ہی نہیں ہم کہاں رہے
دنیا میں بے نیازِ زمان و مکاں رہے

جس آرزو میں تیری خوشی بھی نہ ہو شریک
وہ آرزو نصیبِ دلِ دشمناں رہے

اللہ رے اعتبارِ محبت کی مشکلیں
ہر جنبشِ نگاہ پہ وہ بدگماں رہے

اَب یُوں گزر رہی ہے محبّت میں زندگی
جیسے اندھیری رات میں دریا رواں رہے

یارب تلافیِ غمِ مافات کے لئے
اک دن قفس ہی بن کے مرا آشیاں رہے

اُن کا پتہ نہ حُسن کو ہے اور نہ عشق کو
جو واقعات، اُن کے مرے درمیاں رہے

پہنچے نہ آہ لے کے قفس کی اُداسیاں
یارب ہوا کا رُخ نہ سوئے آشیاں رہے

میرے بھی دل میں تم سے وہ دیکھی نہ جائے تو
دُنیا میں تم بتاؤ محبّت کہاں رہے

اللہ رے شوقِ منزلِ مقصود آ گئی
سو مرحلے اگرچہ ابھی درمیاں رہے

بسملؔ غرور بن کے نہ شاعر میں گر سمائے
تو عجز یا کمالِ تکبّر کہاں رہے

لہو جو گرم نہ کر دے وہ آرزو کیا ہے
جو آرزو سے نہ گرمائے وہ لہو کیا ہے

یہ جانِ حسن و محبّت ہے آرزو کیا ہے
نہ ہو یہ دل میں تو میں کیا ہوں اور تو کیا ہے

تجھے بھی بھول گئے تیرے ڈھونڈنے والے
یہ ہوش بھی تو نہیں ہے کہ جستجو کیا ہے

خدا کرے، نہ کرے حسن سے تجاوز عشق
ابھی تو مجھ سے وہی کہہ رہے ہیں تو کیا ہے

غلط سمجھ کے نہیں دیکھتا ہوں تیری طرف
یہ دیکھتا ہوں کہ اندازِ گفتگو کیا ہے

جنہیں ہے تجھ سے محبّت وہ جانتے بھی نہیں
کہ رشک کہتے ہیں کس چیز کو عدو کیا ہے

ہے اُن کی جنبشِ ابرو پہ آبرو کا مدار
جنہیں خبر بھی نہیں ہے کہ آبرو کیا ہے

سوائے ذوقِ نظر اور کچھ نہیں بسملؔ
یہ پھول کیا ہیں، یہ پھولوں میں رنگ و بو کیا ہے

نہ ملے نشاطِ بہشت کیوں مجھے اپنی عرضِ نیاز میں
مری عرضِ شوق جھلک رہی ہے ترے تبسّمِ ناز میں

وہی اُٹھ رہی ہیں یہ دمبدم وہی بن گئی ہیں ترے قدم
جو ہوئی ہیں صرف قیامتیں تری طرزِ قامتِ ناز میں

دو جہاں کا لُطف ہے عشق سے کہ بغیرِ عشق نصیب ہو
نہ سکونِ رُوح گناہ میں نہ حضورِ قلب نماز میں

نہیں شوخیوں کو نصیب وہ جو یہ ڈھا رہی ہے قیامتیں
یہ حیا کی ایک جھلک جو ہے تری چشمِ فتنہ طراز میں

جو شریعت آج ہے معترض مرا منہ تکے گی وہ روزِ حشر
ترا حُسن پیش جو ہو سکا مری معصیت کے جواز میں

ابھی میرے عشق کی چتونوں کو ہیں یاد اپنی وہ نخوتیں
وہ شکست سی ترے حُسن کی وہ نیاز سا ترے ناز میں

جو ہیں تیرے دامنِ ناز میں دو جہاں بھی تو مجھے کیا غرض
مرے دستِ شوق کی جرأتیں نہیں تیرے دامنِ ناز میں

جو نمودِ صبحِ ازل ہوئی تو مزاجِ حُسن میں حل ہوئی

وہ ادا جو رنگ ہے پھول میں وہ صدا جو نغمہ ہے ساز میں

مجھے اپنے در سے اُٹھا تو دے مگر اپنے دل میں یہ سوچ لے

ترا آستانۂ ناز بھی ہے مری جبینِ نیاز میں

وہ ہوئے ہیں سجدے ابھی ادا جو تمہارے حسن کے حق کے تھے

ابھی میرے عشق کے سجدے تو ہیں مری جبینِ نیاز میں

یہ مری نگاہیں جو تیرے در کو پلٹ پلٹ کے ہیں دیکھتی

یہ وہ سجدے ہیں کہ جو رہ گئے تھے مری جبینِ نیاز میں

یہ عالم ہے کسی کے حُسن کی نازک ادائی کا
مجھے احساس مشکل ہے ستم کی ناروائی کا

جو ناکردہ گنہ کی طرح باقی کوئی رہ جائے
وہی سجدہ ہے تیرے در پہ حاصل جبہ سائی کا

محبّت کے نہایت نازک احساسات ہوتے ہیں
شگفتِ گُل پہ بھی ہوتا ہے دھوکا جگ ہنسائی کا

کسی کے دل کی دھڑکن تک کوئی محسوس کرتا ہے
محبّت میں یہ اک عالم بھی ہوتا ہے جُدائی کا

معاذاللہ شیخ و برہمن کا ظاہر و باطن
گناہوں نے پہن رکھّا ہے جامہ پارسائی کا

شروعِ عشق سے گویا وفاؤں ہی میں گزری تھی
کیا کچھ اس اَدا سے عذر اس نے بیوفائی کا

گنہگاری مِری عینِ مشیّت ہے مگر بسمل
مجھے باغی کہا جاتا ہے احکامِ خدائی کا

ہر سانس میں فریبِ تمنّا لئے ہوئے   بیٹھا ہوا ہوں وعدۂ فردا لئے ہوئے

وہ ہر ادا میں عرضِ تمنّا سے بے نیاز   میں ہر نظر میں عرضِ تمنّا لئے ہوئے

کیا پھر بھی دردِ لائقِ درماں ہے چارہ گر!   جب سانس درد کا ہو سہارا لئے ہوئے

ناکام اُٹھنے والے بھی اُس بزمِ ناز سے   اُٹھتے ہیں اک اُمید کی دُنیا لئے ہوئے

وہ بے نیازِ شوق بھی شوق آفریں بھی ہے   بے التفاتیوں میں تقاضا لئے ہوئے

سُن اے نگاہِ شوق! یہ خاموش سازِ حسن   آتے ہیں وہ نگاہ میں نغمہ لئے ہوئے

غنچوں کو بخشتے ہیں جو ہنس کر شگفتگی   وہ آگئے بہار کا مژدہ لئے ہوئے

دیکھا وطن کی شام، سرِ راہ، صبح سے   بیٹھا ہوں بے کسی کا جنازہ لئے ہوئے

بسملؔ یہ رازِ عشق ہے کیونکر چھپائیے
ہر جنبشِ نظر ہے فسانہ لئے ہوئے

عدو سے نہ مجھ سے نہ محفل سے پوچھے
تجھے تو کوئی تیرے ہی دل سے پوچھے
یہ نخوت کوئی پھر ترے دل سے پوچھے
تری بات جب کوئی مشکل سے پوچھے
وہ کب تک رہے گا خرابِ تجسس
جو دیوانہ منزل کو منزل سے پوچھے
جب آجائے چلنے پہ تیغِ محبت
نہ قاتل سے پوچھے نہ بسمل سے پوچھے
نہ پوچھے کوئی اُن کی محفل کی ہم سے
ہمیں اب کوئی اُن کی محفل سے پوچھے
خوشا لذّتِ زخمِ تیغِ محبّت
کہ قاتل بھی خود جس کو بسمل سے پوچھے
چلا ہوں وہاں لے کے افسانہ غم کا
جہاں بات بھی کوئی مشکل سے پوچھے
وہ اُن کی اداؤں پہ مرمٹنے والا
ادائیں کوئی اُن کی بسمل سے پوچھے

بیانِ حُسن کے قابل کہاں زباں میری
بقدرِ عشق نہیں طاقتِ بیاں میری
بغیرِ عزم و ارادہ ہیں کاروبارِ جنوں
نہیں ہے میری طبیعت بھی رازداں میری
یقیں نہ آئے کسی اور کی طرف سے مجھے
اگر سُنائے کوئی مجھ کو داستاں میری
ہر ایک چیز ادا کر رہی ہے فرض اپنا
بیان غیر کا، بزم اُن کی داستاں میری
اب اُس نظر کو مرا آخری سلامِ وفا
جو بن گئی تھی کبھی عمرِ جاوداں میری
وہ باوفا نہ عدو باوفا مگر بسملؔ
یہ قہر ہے کہ محبّت ہے درمیاں میری

کسی کے عشق میں اللہ رے یہ بیگانگی اپنی
نہ اپنی زندگی اپنی نہ اپنی موت ہی اپنی

محبّت نے کسی کی چھین لی ہے زندگی اپنی
نہ اب کوئی غم اپنا ہے نہ اب کوئی خوشی اپنی

قیامت ہے وہ غم جس غم سے یاد آئے خوشی اپنی
نظر آتی ہے اپنے آنسوؤں میں اب ہنسی اپنی

وہ لمحے بیکسانِ عشق کے ننگِ محبّت ہیں
کہ جن لمحوں میں ہو محسوس ان کو بے کسی اپنی

کچھ اُن کا حُسن بھی بیگانۂ ذوقِ محبّت تھا
کچھ اُن کے حُسن کے لائق محبّت بھی نہ تھی اپنی

خدا توفیق دے ایفائے عہدِ قتل کی اُن کو
مجھے معلوم ہوتی ہے اب اپنی زندگی اپنی

غرورِ حُسن ہے اور ہر ادائے بے نیاز اُن کی
نیازِ عشق ہے اور ہر نگاہِ ملتجی اپنی

نہیں اپنے کِسی مقصد سے خالی کوئی بھی سجدہ
خدا کے نام سے کرتا ہے انساں بندگی اپنی

خوشی کے نام سے نفرت ہے جب سے ہم یہ سمجھے ہیں
کہ بنتی ہے کسی ناشاد کے غم سے خوشی اپنی

وہ شاید زندگی سے قبل اپنی موت تھی بسمل
کسی کے عشق سے پہلے جو گزری زندگی اپنی

ہوا ہوگا وہ شادی مرگ فرطِ شادمانی سے
خوشی کیا ہو مجھے دشمن کی مرگِ ناگہانی سے

یہ عمرِ عاشقی جو موت سے بدتر گزرتی ہے
نہ بدلوں اس کا اِک لمحہ بھی عمرِ جاودانی سے

مذاقِ عشق سے ہے عرصۂ ہستی کا اندازہ
حیاتِ جاودانی سے نہ مرگِ ناگہانی سے

یہ دیتے ہیں مجھے طعنے تری نامہربانی کے
جو میرا حال مجھ سے پوچھتے ہیں مہربانی سے

معاذاللہ سبحل آپ اندازہ لگاتے ہیں
خدا کی مہربانی کا بتوں کی مہربانی سے

کبھی مانوسِ تمنّا نہیں دیکھا تم کو
چاہے جاتے ہیں مگر اہلِ تمنّا تم کو

اپنی ناکام نگاہوں کی قسم کھاتا ہوں
جو تمہیں دیکھ سکا اس نے نہ دیکھا تم کو

باہمہ حسرتِ دیدار و ہمہ ذوقِ نظر
آنکھ بھر کر کبھی میں نے نہیں دیکھا تم کو

دِل دھڑکنے ہی لگا آنکھ جھپکنے ہی لگی
باوجودے کہ بہت دُور سے دیکھا تم کو

اے زہے عشرتِ نظّارہ و معراجِ نظر
میں نے جب اپنی طرف دیکھتے دیکھا تم کو

نہ ہوئی جذبِ محبّت کی گوارا توہین
کہ دُعا کر کے خدا سے کبھی نہ مانگا تم کو

مجھ کو ہر ظلم گوارا ہے تمہارا لیکن
یہ گوارا نہیں کہتی ہے جو دنیا تم کو

کیوں کر امکانِ محبّت کی حدیں توڑ سکے
کس طرح چاہے کوئی حسبِ تمنّا تم کو

ناروا اُن کی ہر اک بات ہو تسلیم لیکن
اُن سے یہ کون کہے یہ نہیں زیبا تم کو

آساں نہیں ہے دوستی رکھنا کسی کے ساتھ
دُنیا کی دشمنی ہے تری دوستی کے ساتھ

جتنا ہوں تجھ سے پاس میں اُتنا ہی دُور ہوں
بڑھتی ہے لیعنی بے خبری آگہی کے ساتھ

ہے پرسشِ فرائض و اعمال روزِ حشر
ماخوذ خضر بھی ہیں مری گمرہی کے ساتھ

کیا فرض ہے ہر ایک گُنہ کا مواخذہ
شرطِ قبولیت ہے اگر بندگی کے ساتھ

کیوں عشق میں ہے اُن سے اُمیدِ وفا مجھے
شاید کسی نے کی ہے وفا بھی کسی کے ساتھ

تنہائی میں تو لطفِ عیادت ہی خوب ہے
بسمل مزہ شراب کا آتا ہے پی کے ساتھ

اس طرح دُنیا میں دل کو محرمِ غم کیجیے
جب خوشی کوئی میسّر ہو تو ماتم کیجیے

حُسن کی جانب نگاہِ شوق یا کم کیجیے
یا نگاہِ شوق کو اک عہدِ محکم کیجیے

موت کا کیا موت کا تو سو طرح غم کیجیے
زندگی ناشاد کا کس طرح ماتم کیجیے

دیکھ کر اہلِ طرب کا ساز و سامانِ طرب
بدنصیبوں کا زرا اندازۂ غم کیجیے

جانے کس عالم کی حسرت میں ہیں نظریں مضطرب
ورنہ کیا نظّارۂ حسنِ دو عالم کیجیے

غم کو ہونے دیجیے ہو جس قدر مانوسِ دل
دِل کو جتنا ہو سکے بیگانۂ غم کیجیے

تاکجا آوارۂ نظّارہ چشمِ حُسن دوست
جمع اک مرکز پہ کیوں کر حُسنِ عالم کیجیے

ہر خوشی نے اس نتیجے پر ہمیں پہنچا دیا
جب خوشی کوئی میسّر ہو تو ماتم کیجیے

آرزو سے بڑھ کے دشمن کوئی انساں کا نہیں
جس قدر ممکن ہو بسمل آرزو کم کیجیے

شبِ فراق، شبِ انتظار بھی تو نہیں
نصیب' لذتِ بیدادِ یار بھی تو نہیں
تری جفاؤں کا شکوہ کروں میں کس دل سے
تری جفائیں مجھے ناگوار بھی تو نہیں
جو تجھ پہ مرتے ہیں کس بات پر وہ مرتے ہیں
کسی کی موت پہ تُو سوگوار بھی تو نہیں
بقدرِ عشق نہیں ہے اگرچہ میری وفا
مگر جفا سے تری شرمسار بھی تو نہیں
کسی کے غم کی یہ مجبوریاں معاذاللہ
مجالِ خندۂ بے اختیار بھی تو نہیں
زمینِ شعر میں کیوں گل فشاں نہ ہو بسمل
زمینِ شعر کم از کوئے یار بھی تو نہیں

دل میں کیا صرف حسرتِ پرواز　　دے پروں کو بھی زحمتِ پرواز

ایک قطرہ بساطِ شبنم، گُل　　مگر اللہ ری ہمّتِ پرواز

ہے پرِ کاہ بھی پرِ جبریل　　گر میسّر ہو جراَتِ پرواز

ہے بہارِ بہشت و حُسنِ حور　　اک تخیّل کی نزہتِ پرواز

راحتِ آشیاں ہے اس پہ حرام　　جس کو ہے ذوقِ لذّتِ پرواز

دام و صیّاد و برق کچھ بھی نہیں　　ہو پَروں میں جو قوّتِ پرواز

بال و پر ہوں نہ جب تک آہن و سنگ　　نامناسب ہے شدّتِ پرواز

کوئی ہو بھی فضا شناسِ چمن　　کِس سے کہئے نزاکتِ پرواز

یہ بھی ہے اک فریبِ صیّادی　　کون دیتا ہے مُہلتِ پرواز

اُس طرف ہیں فضائیں زہریلی　　اِس طرف ہے اجازتِ پرواز

مرحمت کر کے بال و پر بسمل

سلب کرلی ہے طاقتِ پرواز

کس قدر تھی فرصتِ نظّارہ آنکھوں کو نصیب
جب نگاہیں تھک گئیں تو دل میں ارماں ہوگئیں

بزم میں آکر جو مجھ تک پھر نہ واپس جا سکیں
وہ نگاہیں دل میں رہ کر دردِ پنہاں ہوگئیں

حُسنِ غارت گر سے کیا بچتی متاعِ آرزو
عِشق کی ناکامیاں ہی کچھ نگہباں ہوگئیں

کون دے گا ہنس کر اب دادِ زبوں حالی مجھے
آج وہ کافر نگاہیں بھی پشیماں ہوگئیں

او حقیقت ناشناسِ معصیت او طعنہ زن!
قُلزمِ رحمت کی موجیں بڑھ کے عصیاں ہوگئیں

عشق کے دو دن پریشانی میں گزرے تھے ابھی
مُدّتوں کو حُسن کی راتیں پریشاں ہوگئیں

آرزوؤں سے ہوئی بیدار بسمل زندگی
آرزوئیں زخمۂ تارِ رگِ جاں ہوگئیں

مطمئن ہم ہیں زندگانی سے ۔۔۔ اے اجل تیری پاسبانی سے
غنچۂ دِل کھِلے گا اب کیا خاک ۔۔۔ میری تربت پہ گل فشانی سے
اے غمِ عشق چھین لی تُو نے ۔۔۔ زِندگی میری زندگانی سے
کیا کوئی شہرِ دل بچا ہوگا ۔۔۔ اس محبّت کی حکم رانی سے
کس قدر ہے پسندِ خاطرِ عشق ۔۔۔ نیند اُڑ جائے جس کہانی سے
مجھ پہ ہے کتنی مہرباں دُنیا ۔۔۔ صِرف اک تیری مہربانی سے
وائے انجامِ عشرتِ ہستی ۔۔۔ دل لرزتا ہے شادمانی سے
حُسن اور عشق تو بہانے ہیں ۔۔۔ موت کو لاگ ہے جوانی سے
ہم رہے چُپ تو وہ ہوئے خاموش ۔۔۔ بَن گئی بات بے زبانی سے
پھر بھی اچھّا ہے میرا حال ابھی ۔۔۔ تم نہ پوچھو جو مہربانی سے

چند لمحاتِ عیش میں بسمؔل
وقت گزرا ہے کس رَوانی سے

جو منزلِ مُتعیّن ہے آرزو کے لئے
وہ رہگزر ہے مرے ذوقِ جستجو کے لئے

یہ پھول دیکھ کے اندازۂ بہار نہ کر
کھلیں گے اور ہی کچھ پھول رنگ و بو کے لئے

مزہ تو جب ہے کہ مجبورِ آرزو ہو جائے
ترا کرم مرے دامانِ آرزو کے لئے

ذلیل ہو کے کہاں آبرو کی مانگیں بھیک
بہت ہے عزّتِ نفس اپنی آبرو کے لئے

کچھ اِس ادا سے جھپکتے ہیں وہ پلک یکسر
کسی کے ہونٹ ہلیں جیسے گفتگو کے لئے

بہت ہوں گے کسی کا حسنِ کامل دیکھنے والے
مگر ہوں گے نہ میرا عالمِ دِل دیکھنے والے

کبھی پُوچھ اپنے غم سے میرے دِل کے ذوق کا عالم
دو عالم کی خوشی دے کر مرا دل دیکھنے والے

نہ وہ مُنکر خدا کے ہیں نہ جنّت کے نہ دوزخ کے
یہ کیا کچھ دیکھ آئے تیری محفل دیکھنے والے

مِرا خورشیدِ اَوجِ زندگی کیا دیکھ سکتے تھے
مری شمعِ سرِ تربت بہ مشکل دیکھنے والے

تری محفل میں آ بیٹھے تھے بزمِ خلد سے اُٹھ کر
کہاں جائیں گے اُٹھ کر تیری محفل دیکھنے والے

محبّت اک وہ بے سمت و جہت عالم ہے جس میں ہیں
تجھے ہر سمت سے اپنے مقابل دیکھنے والے

زیادہ نااُمیدِ عافیت دل ہوتا جاتا ہے
سفینہ جس قدر نزدیکِ ساحل ہوتا جاتا ہے

تغیّر آشنائے بزم ہر دل ہوتا جاتا ہے
کسی کو کیا خبر کیا رنگِ محفل ہوتا جاتا ہے

جہاں تک التفاتِ حُسن حاصل ہوتا جاتا ہے
محبّت کا اثر اُتنا ہی زائل ہوتا جاتا ہے

محبّت میں مرے دل کی نزاکت کا یہ عالم ہے
کہ احساسِ محبّت بھی تو مشکل ہوتا جاتا ہے

جدھر منہ پھیرتا جاتا ہوں گھبرا کر تصوّر سے
وہ حُسن ہر جہت میرے مقابل ہوتا جاتا ہے

تری محفل بھی کتنی ہم مزاجِ عشق ہے ظالم
جو آتا ہے شریکِ رنگِ محفل ہوتا جاتا ہے

شروعِ عشق میں یہ صورتِ حالات ہے باہم
اِک آئینے کے آئینہ مقابل ہوتا جاتا ہے

مرے سجدوں کے نامقبول ہونے کی قسم بسملؔ
وہ سنگِ آستاں سجدوں کے قابل ہوتا جاتا ہے

کسی سے تو کسی کی موت ہی دیکھی نہیں جاتی
مگر مجھ سے تو اپنی زندگی دیکھی نہیں جاتی

جب ان کی دوستی تھی مجھ سے کہتے تھے اعدا دیکھو
اور اب میری عدو کی دوستی دیکھی نہیں جاتی

تمہارے در سے ہم ناکام اُٹھ کر آئے ہیں جب سے
کسی در پر جبینِ بندگی دیکھی نہیں جاتی

مری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر او دیکھنے والے
تری نظروں کی یہ بیگانگی دیکھی نہیں جاتی

وہ کچھ اس طرح مجھ کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں
کہ جیسے میری حالت واقعی دیکھی نہیں جاتی

لرزتا تھا کبھی دِل مرگِ بسمل کے تصوّر سے
مگر کم بخت کی اب زندگی دیکھی نہیں جاتی

التجائیں کرنے والے کو دُعا سے کیا غرض
جس کو ہو تم سے غرض اس کو خدا سے کیا غرض

پی رہا ہے مُسکرا کر جامِ صحت موت کا
تیرے بیمارِ محبّت کو دوا سے کیا غرض

اب گھٹائیں میکدے پر چھائیں تو میں کیا کروں
بے دلی کو دعوتِ آب و ہوا سے کیا غرض

رُوح کو بالیدگی ہو جس میں اب وہ دل نہیں
ہم نشیں مجھ کو بہارِ جاں فزا سے کیا غرض

کس قدر خوش رہ کے مر جاتے ہیں مظلومانِ عشق
کوئی یہ سمجھے اِنہیں روزِ جزا سے کیا غرض

قہر کو بھی جس کے ہو اک درگزر سے واسطہ
اس کی رحمت کو مرے جرم و خطا سے کیا غرض

اب دِل ناکام میں وہ نالہ و نغمہ کہاں
بسمؔل اِک سازِ شکستہ کو صدا سے کیا غرض

اِک مے کدہ ہے جس کی جبیں سے نہ بَل گئے
دیر و حرم تو وقت کے سانچوں میں ڈھل گئے

یہ ارتباطِ رحمت و مے خانہ دیکھنا
اُٹھّی اُدھر گھٹا کہ اِدھر جام چل گئے

اپنے جنونِ جوشِ تجسّس میں اہلِ ذوق
اکثر حُدودِ دیر و حرم سے نکل گئے

اُن ابروؤں کی چھاؤں میں رقصاں ہیں آجتک
وہ جنبشیں کہ جن سے زمانے بدل گئے

جے پُور آکے آئے جو احبابِ ٹونک یاد
جذباتِ شوق اور بھی دل میں مچل گئے

تھے غرقِ کربِ روح جو اشعارِ حُزنیہ
ناظم[۵۱] کی قبر پر مرے اشکوں میں ڈھل گئے

ق

اے ساقیٔ طرب[۵۲]! وہی رحمت کدہ ہے یہ
مے خانۂ نشاط کے نقشے بدل گئے

توفیقِ خیر پھر ہو تجھے مے کدہ نواز
ہم پھر سُنیں کہ بزم میں پھر جام چل گئے

برسوں کے بعد بزمِ مکرّم میں آکر آج
بسمل حدِ زمان و مکاں سے نکل گئے

---

۵۱ میرے عزیز دوست ناظم مرحوم سنبھلی

۵۲ خطاب بہ حضرت نواب مکرّم بہ اشارۂ ترکِ مے و مینا۔

تم ہو جب میرے لئے ہیں دو جہاں میرے لئے
یہ زمیں میرے لئے یہ آسماں میرے لئے

اس طرح جذباتِ آزادی بہل جائیں گے کیا
بن رہا ہے کیوں قفس میں آشیاں میرے لئے

رو رہا ہوں آج میں سارے جہاں کے واسطے
روئے گا کل دیکھنا سارا جہاں میرے لئے

اِضطرابِ شوق سے کیا کیا ہوئی ہیں لغزشیں
التفاتِ یار نے جب امتحاں میرے لئے

بے پناہی ہے یہی بسملؔ جو حسن و عشق کی
ہو گی ناکافی حیاتِ جاوداں میرے لئے

دیکھوں نہ سوئے خُلد، اُٹھا کر نِگاہ بھی
اے حُسنِ اتّفاق اِک ایسا گُناہ بھی
ہے کتنی جلوہ ساز تِری جلوہ گاہ بھی
اِک موجِ حُسن بن گئی میری نِگاہ بھی
اِک آرزوئے شوق ہے جس پر الگ الگ
میری نگاہ بھی ہے، تمہاری نِگاہ بھی
کیا چیز دِل میں ہے کہ ابھی ناتمام ہے
حالانکہ کامیاب ہے دِل بھی، نِگاہ بھی
زاہد بُرا کسی کو نہ کہہ کیا خبر تجھے
اچّھا ہو بندگی سے کسی کا گُناہ بھی
بن کر کبھی تلاش، کبھی لذّتِ تلاش
اِک شوق راہبر بھی ہے اور سدِّ راہ بھی

دُنیا میں ہیں ایسے بھی اِس عشق کے دیوانے
منزل نہ جنوں اُن کی، مقصود نہ ویرانے

بالیں پہ دمِ آخر اپنے ہیں نہ بیگانے
وہ شمعِ سحر ہوں میں جس پر نہیں پروانے

عِبرت کا مُرقّع ہیں دُنیا میں وہ ویرانے
باقی ہیں ابھی جن کی آبادی کے افسانے

محرابِ حرم! کب تک سجدوں کی یہ ناقدری
دینے نہ لگیں مجھ کو آواز صنم خانے

ملحوظ نہیں جن کی عِشرت میں خوشی تیری
وہ عیش محل اِک دن بن جائیں گے غم خانے

تاریخ سے دُنیا کی ہرگز نہ مِٹیں گے وہ
جو عِشق نے لکھّے ہیں اِنسان کے افسانے

کل تک تو تُجھے بسملؔ غیروں کی مُروّت تھی
آج اپنوں سے جاتا ہے مُنہ پھیر کے بیگانے!

احساسِ دردِ عشق کے قابل بنا دیا

تیری نظر نے دل کو مرے دل بنا دیا

بربادیوں پہ عشق کی قربان جائیے

تیری نگاہِ لطف کے قابل بنا دیا

دیدار تک تو قابلِ دیدار خود رہے

پھر میرا حال دید کے قابل بنا دیا

مشکل تو عشق میری وفا سے بھی تھا مگر

تیری وفا نے اور بھی مشکل بنا دیا

سودا سہی جنون سہی عاشقی مگر

سر آستانِ یار کے قابل بنا دیا

اب تک برائے نام رہا یا برائے بیت

ہاں اب تری نگاہ نے بسمل بنا دیا

دِلدادۂ حُسن آپ کو کچھ کم نہ ملیں گے
مِل جائیں گے ہم سے کبھی مگر ہم نہ ملیں گے
جس روز یہ چاہیں گے مجھے تُم سے مِلانا
اس روز یہ دن رات ہی باہم نہ ملیں گے
گر تم مُتوجّہ بھی ہوئے صورتِ خورشید
ہم تو صفتِ دیدۂ شبنم نہ ملیں گے
جس دن نہ رہیں گے مری قسمت کے بَل اس میں
اُس روز تری زلف کو یہ خم نہ ملیں گے
کہتی ہے جسے بزم تری "عیش و مسرّت"
کیا حُسن کی ہر بزم میں وہ غم نہ ملیں گے
کچھ روز کے مہمان ہیں پھر حضرتِ بسملؔ
وابستۂ دامانِ مُکرّم نہ ملیں گے

پاس رہتا ہے، دُور رہتا ہے
دِھیان میں وہ ضرور رہتا ہے
ہائے اُس کی نوازشِ پنہاں
کِس قدر دُور دُور رہتا ہے

شوق کی کامیابیاں تسلیم
دِل مگر ناصُبور رہتا ہے
دِل جو رہتا تھا اپنے پاس کبھی
وہ بھی اَب دُور دُور رہتا ہے

حاصلِ عِشق ہے یہی بسمل
یہ جو دِل پر سُرور رہتا ہے

جو نہیں عشق کے قابل کسی قابل ہی نہیں
جذبۂ عشق اگر دل میں نہیں ، دل ہی نہیں

اَب کچھ اِس طرح میں اُس بزم میں ہوتا ہوں شریک
کوئی سمجھے کہ یہ وابستۂ محفل ہی نہیں

راس کیا دردِ محبّت کا مداوا آئے
دِل ابھی دردِ محبّت کے تو قابل ہی نہیں

لذّتِ عشق ہی سے رُوح کا یہ عالم ہے
اور ابھی حُسن تو احساس کے شامل ہی نہیں

خود نہ بڑھ آئے اگر حُسن ہی تا منزلِ عشق
منزلِ عشق سے آگے کوئی منزل ہی نہیں

کبھی مسجودِ نظر بھی تو ہو، اے کعبۂ رُوح!
آرزو مند یہ آنکھیں بھی تو ہیں دِل ہی نہیں

شمع بھی جلتی ہے، پروانے بھی جلتے ہیں مگر
تیری محفل میں وہ اَب گرمیِ محفل ہی نہیں

سہل ہو گی مری مُشکل تو تمہیں سے ہو گی
کہ کسی اور کو اندازۂ مشکل ہی نہیں

تھی کاہشِ فراق ابھی کیوں وصال میں
کیا تم چلے گئے تھے کسی کے خیال میں

رہنے دے عُذر خواہیِ ظلم، او ستم شعار
لاکھوں ستم ہیں اک نگہِ اِنفعال میں

آئینہ رکھ کے سامنے شرما کے رہ گئے
کون آگیا نظر اُنھیں اپنے جمال میں

میں فرطِ اضطرابِ تمنّا کو کیا کروں
اِتنی ہی دِل کشی ہے کسی کے جمال میں

باقی ہے کیا ابھی کوئی حسرت گُناہ کی
دِل کیوں نہیں شریک مِرے اِنفعال میں

راتیں اُسی کی، دِن ہیں اُسی خوش نصیب کے
وہ جس کے خواب میں ہیں، وہ جس کے خیال میں

بسملؔ اگر نہیں ہے محبّت اِسی کا نام
تو پھر یہ اِضطراب سا کیا ہے وصال میں

گفتگو ہے یہ مئے عشق کے سرشاروں کی
ہوشیاری نہیں تقدیر میں ہشیاروں کی

نخوت و ناز کا پھر اُس کی ٹھکانا کیا ہے
بے نیازی ہو صفت جس کے طلب گاروں کی

موت آزاد کئے دیتی ہے ایک اِک کر کے
کچھ خبر بھی ہے تمہیں اپنے گرفتاروں کی

مجھ سے نفرت بھی ہے اندازۂ غم کا بھی ہے شوق
دیکھ لیتے ہیں وہ صورت مرے غم خواروں کی

بادلوں میں نظر آتی ہے جو بجلی بسمل
یہ چمکتی ہوئی تقدیر ہے میخواروں کی

اُف یہ عالم تری رعنائی کا
کیف آنکھوں میں ہے انگڑائی کا

بنتی رہتی ہیں نگاہیں میری
آئینہ اُن کی خود آرائی کا

چاک دامن نہ گریباں پُرزے
یہ بھی اِک حال ہے سودائی کا

کوچۂ حُسن تک اے رہروِ عشق
راستہ جاتا ہے رُسوائی کا

جو جہاں ہے، وہیں تجھ سے ہے قریب
ہے کمال انجمن آرائی کا

آئینے سے بھی وہ شرماتے تھے
ہائے کیا وقت تھا رسوائی کا

بسملؔ اَب ختم ہے ذلّت پہ مری
سلسلہ عزّتِ آبائی کا

یہ عشق جُرم بھی ہے لائقِ سزا بھی ہے
سزا کی حد بھی مگر کوئی انتہا بھی ہے

کرو وفا کو نہ بدنام بادفا بن کر
وفا کا نام کبھی آپ نے سنا بھی ہے

ہر اک سے ملتے ہو آنکھوں میں ڈال کر آنکھیں
تمھاری آنکھوں میں کچھ شرم بھی حیا بھی ہے

یہ کب کہا ہے کہ جھوٹے ہو، جھوٹ بولتے ہو
یہ پوچھتا ہوں کہ جھوٹے کی کچھ سزا بھی ہے

کسی کے غم کی تم اُفتادِ غم کو کیا سمجھو
تمھاری آنکھ سے آنسو کبھی گِرا بھی ہے

کہاں ہے درد، کہاں ہاتھ رکھّے بیٹھے ہو
کسی کے دردِ محبّت کا کچھ پتا بھی ہے

جنابِ شیخ! بُرا کام ہے گُناہ، مگر
کسی گُناہ کا موقع کبھی مِلا بھی ہے

رہے گی بن کے جو تاریخِ وقت کا عنواں
مری وفا ہی نہیں ہے تری جفا بھی ہے

بغیرِ درد نہیں ہے کسی مرض کی دوا
یہ عشق، درد جہاں ہے وہیں دوا بھی ہے

کبھی کی ختم ہوئی رہ گزارِ منزلِ حُسن
کوئی کہو کہ محبت کی انتہا بھی ہے

ہنسا جو گریۂ شبنم پہ گُل، صبا نے کہا
کسی کے رونے پہ ظالم کوئی ہنسا بھی ہے

ہر ایک شخص جہاں میں صدا ہے گنبد کی
بُرے ہم آپ نہ ہوں تو کوئی بُرا بھی ہے

جو ہو خلافِ مزاجِ دوا، مزاجِ مرض
تو موت کہتے ہیں جس کو وہی شفا بھی ہے

محیطِ ذات کسی کے کہاں مظاہرِ حُسن
وہ اپنے حُسن کے عالم سے ماورا بھی ہے

ربابِ دہر پہ ہے کون نغمہ زن یارب
صدائے نغمہ ہی نوحے کی اک صدا بھی ہے

بغیر عشق میسّر کسے مراتبِ عشق
اگر حُسین کوئی ہو تو کربلا بھی ہے

پھر اپنی اپنی طبیعت کی بات ہے بسملؔ
فنا بھی عشق ہے اور عشق ہی بقا بھی ہے

وقت کب تک گزاریے آخر　　یوں کہیں زندگی گزرتی ہے
کون محفوظ ، کون مستثنیٰ　　کس کو دنیا معاف کرتی ہے
وہ جو ہے رہگزارِ منزلِ وصل　　وادیٔ ہجر سے گزرتی ہے
کس کی رنگینیٔ جمال ہے یہ　　جو بہاروں میں رنگ بھرتی ہے
حالِ دل اب کسی سے کیا کہیئے　　جو گزرتی ہے وہ گزرتی ہے
شعر کی فکر ہو گئی الہام　　دل پر اک وحی سی اُترتی ہے
میں ہوں اب اور وہ زندگی بسملؔ　　موت جس زندگی سے ڈرتی ہے

جو نظر کہ نزہتِ گُل پہ ہے وہ نظر ہے زحمتِ خار پر
کہ سوادِ شامِ خزاں بھی تو ہے فروغِ صبحِ بہار پر

رہ و رسمِ منزلِ عشق اب ہے تمام اُن کے شعار پر
جو نہ چل سکے کبھی دو قدم بھی وفا کی راہگزار پر

وہ نظر ہی اصل میں ہے نظر جو نظر ہے جلوۂ یار پر
نہ وہ دَیر کے در و بام پر نہ حرم کے نقش و نگار پر

وہ کریں جو معذرتِ ستم تو خوشا نصیب وہ زہے کرم
نہ بھُلا سکیں گے مگر وہ ہم جو گزر گئی دلِ زار پر

یہ مری جبینِ حیات پر مری سرنوشتِ ازل نہیں
یہ وہ کتبۂ غمِ مرگ ہے جو لکھا ہو لوحِ مزار پر

جو ہوا میں کیفِ نَفَس نَفَس تو فضا میں رنگِ نظر نظر
ترا حُسن ہے یہ شباب پر کہ بہشت اپنی بہار پر

مری زندگی ہی کا بوجھ کچھ نہیں تحمل ارضِ وطن پہ کم
مری موت کا تو خدا کرے نہ ہو بار خاکِ دیار پر

وہ جو ارضِ پاکِ حجاز ہے مری آرزو ہے کہ بسملؔ اب
ہو نصیب سجدۂ آخری اسی خاکِ عرشِ وقار پر

فریبِ عقل میں مجنونِ عشق آ نہ سکا   بھلا دیا اسے آنکھوں نے دل بھلا نہ سکا

نہ دل بلا نہ ملیں دل کی لذّتیں اس کو   جو تیرے دردِ محبّت کو دل بنا نہ سکا

مجھے جنونِ محبت نے اس جہاں میں رکھا   کہ جس جہاں میں کوئی انقلاب آ نہ سکا

گزر گیا ہے محبت میں اک وہ عالم بھی   کہ مدتوں مجھے تو خود بھی یاد آ نہ سکا

قیودِ عشق سے شاید گزر گیا ہو کوئی   حدودِ حسن سے لیکن نکل کے جا نہ سکا

نہ بن گیا ہو ترا عشق اضطراب کہیں   تسلّیوں سے تری اضطراب جا نہ سکا

عجیب چیز ہے ہستی کی نیستی بسمل

کہ جو یہاں سے گیا پھر کبھی وہ آ نہ سکا

جبینِ شوق رہ سکتی تھی جذبِ آستاں ہو کر
اگر یہ ذوقِ سجدہ رہ نہ جاتا درمیاں ہو کر

فغاں اک قہقہہ بن کر نکلتی تھی کبھی دل سے
مگر اب قہقہہ منہ سے نکلتا ہے فغاں ہو کر

دلوں کے گرم جذبے سرد آہیں بن گئے اے عشق
ترے آتشکدوں میں رہ گئے شعلے دھواں ہو کر

یہ کیا دستور ہے آخر تمہاری بزمِ عشرت کا
جسے محفل میں رہنا ہو رہے ناشادماں ہو کر

ہوئے ہیں خاک اپنے کارواں جن رہگزاروں میں
کل اُن کی خاک کے ذرّے اٹھیں گے کارواں ہو کر

زمانے کی ہر اک چینِ جبین اوراقِ عالم پر
مُرتب ہو رہی ہے وقت کی اک داستاں ہو کر

الٰہی حشر کے دن بے اثر ہو کر نہ رہ جائے
صدائے صُور بھی آوازِ ناقوس و اذاں ہو کر

فرشتوں کی جبیں جھکتی تھی بسمل جس کے قدموں پر
وہ انساں مر گیا سجدہ گزارِ این و آں ہو کر

بے نیازِ رسم و راہِ عام ہونا چاہیے
عشق کو خود حُسن کا پیغام ہونا چاہیے

ہو کسی کی داستاں، میرا ہی افسانہ ہے وہ
ہاں مگر اُس میں تمھارا نام ہونا چاہیے

صبح کا سُورج تو ساقی، ہو گیا کب کا غروب
اب طلوعِ آفتابِ شام ہونا چاہیے

لازم و ملزوم اتنی کوئی دو چیزیں نہیں
شام کو جتنا ضروری جام ہونا چاہیے

رُوح کو پاکیزگی کا پیرہن پہنائیے
جسم پر کیا جامۂ احرام ہونا چاہیے

دوریٔ منزل کو تُو روتا ہے کیا اے سُست گام
دیکھ ابھی تو راستے میں شام ہونا چاہیے

تو یہ سمجھا ہی نہیں اے نو گرفتارِ قفس
جس جگہ دانہ پڑا ہو، دام ہونا چاہیے

مل گئے جب وہ مجھے، پھر حشر میں رکھا ہے کیا
ختم ہو یارب یہ دن اب شام ہونا چاہیے

کیوں کوئی رسوا ہو میرے ساتھ یارب حشر میں
فردِ عصیاں کو مری گمنام ہونا چاہیے

شادیانے بجتے ہوں غم پر کسی کے جس جگہ
اِک نہ اک دن اُس جگہ کہرام ہونا چاہیے

ترجمانِ دل تو ہو سکتی ہے کچھ اپنی ہی فکر
شعر کو مستغنیِ الہام ہونا چاہیے

دیکھ کر بسملؔ تمھاری زندگی، آیا خیال
زندگی کا موت بھی اک نام ہونا چاہیے

جب اہلِ عشق کا ہر حال عاشقانہ تھا
حدودِ عشق سے باہر غمِ زمانہ تھا

بھُلا دیا ترے کانٹوں نے بھی چمن ہم کو
ہمارا تیری بہاروں میں آشیانہ تھا

ترے غرور کو ٹھکرا کے جس نے پھینک دیا
مری جبیں وہ نہ تھی تیرا آست[illegible]ا

اب آنسوؤں نے حقیقت بیان کی اُس کی
جو قہقہوں کی زباں پر کبھی فسانہ تھا

قبولِ سجدہ پہ بھی وہ تو ہو سکا نہ ادا
جو ذوقِ سجدہ پر اک فرضِ آستانہ تھا

وہی ہے فطرتِ عشق اور وہی سرشتِ حُسن
وہی ہے آج زمانہ جو کل زمانہ تھا

پہنچ کے گنبدِ خضرا پہ بسمل اب سمجھا
مری جبیں کے تو لائق یہ آستانہ تھا

معنی و مفہوم کیا ہوں عشق کے مضمون میں ‏ جس طرح کوئی خیال آئے دلِ مجنون میں

عشق سے ہوتی ہے اس شدّت کی گرمی خون میں ‏ کھولتا ہے جیسے دریا دوپہر کو جون میں

جسم میں رگ رگ بھڑک اٹھتی ہے سوزِ عشق سے ‏ گرمِ طغیاں جس طرح امواج ہوں جیحون میں

حسن سے واضح ہوئی ہے معنویّت عشق کی ‏ شاملِ مفہوم ہے عنوان بھی مضمون میں

یوں تو ہیں اجزا بہت سے شاملِ ترکیب عشق ‏ آرزو لیکن سر دار وہے اس معجون میں

اس طرح ہوں قیدیِ حالات بسمل جس طرح
شیر ہو پنجرے میں یا شاہِ ظفر رنگون میں

خُلدِ نظر ہجومِ گُل و یاسمن کہاں — کچھ بھی سہی وہ خلد، تری انجمن کہاں
پیراہنِ بہار، ترا پیرہن کہاں — سو رنگ ہوں بہاریں، رنگِ بدن کہاں
ہم راویِ روایتِ منصور ہیں فقط — دار و رسن کے ذکر میں دار و رسن کہاں
اب وہ متاعِ شوق نہ وہ کاروانِ دل — اب راہِ زندگی میں کوئی راہزن کہاں
پھر اِس کا ذکر کیا کہ وہ پروانے کیا ہوئے — اب وہ فروغِ شمعِ سرِ انجمن کہاں
یہ صبح و شام بھی سحر و شام ہیں، مگر — وہ میکدے کی شام وہ صبحِ چمن کہاں
سازِ دلِ فسردہ ہے بے نغمہ و صدا — کوئی ربابِ شوق پہ اب زخمہ زن کہاں
اب ہم ہیں اور پیچ و خمِ راہِ زندگی — اب ہم کہاں وہ زلفِ شکن در شکن کہاں
پائینِ صدرِ بزمِ سخن دیکھتے رہیں — اپنا کہاں مقام، حریفانِ فن کہاں
ہم اور نظارہ ہائے قد و عارضِ جمال — ہم کو دماغِ جلوۂ سرو و سمن کہاں
کس طرح چل سکیں گے زمانے کے ساتھ ہم — جو وقت کی روش ہے وہ اپنا چلن کہاں

بسمل فضول ہے یہ غمِ مرگِ بیکسی
ہر لاش کے نصیب میں گور و کفن کہاں

عشق، وہ اک نظامِ جبرِ غم جو نہ دے خوشی نہ دے
صدمۂ ہجر اگر نہ دے، مژدۂ وصل بھی نہ دے

جس میں نہ ہر نفس ہو موت، ختم ہو جس سے زندگی
عشق وہ زندگی تو کیا، عشق وہ موت بھی نہ دے

آج اُنھیں دمِ وداع سجدہ ہو آخری مرا
کاش کہ اب مجھے خدا مہلتِ بندگی نہ دے

تجھ سے جُدائی تو نہیں تیرے نہ ہونے کی دلیل
اپنا خیال کر، مجھے طعنۂ بیکسی نہ دے

ہجر کی شام تا بمرگ حشر ہوئے بپا ہزار
اِتنی طویل بھی خدا فرصتِ زندگی نہ دے

غفلتِ حال ہی کو ہے عشرتِ زندگی نصیب
"ذہنِ فریب خوردہ کو زحمتِ آگہی نہ دے"

ہائے وہ دل کہ ہو جسے دردکی زندگی عطا
وائے وہ دل جسے خدا درد کی زندگی نہ دے

خندہ لبی سے بسمل آہ، قلبِ فسردہ خوش ہو کیا
شمعِ مزار جس طرح قبر میں روشنی نہ دے

کب تک فریب خوردۂ انساں رہیں گے ہم
اب اپنے سائے سے بھی گریزاں رہیں گے ہم

ہوتے ہیں اہلِ درد کے آنسو ہی قہقہے
گریاں اگر رہیں گے تو خنداں رہیں گے ہم

افسردگیٔ گُل پہ نہ ہوگی سحر طلوع
شامِ خزاں کی صبحِ بہاراں رہیں گے ہم

ہوتا ہے دردِ عشق اگر دردِ لا دوا
اک دن بنا کے درد کو درماں رہیں گے ہم

تُو جنبشِ نسیمِ سحر ہی سے بجھ گئی
اے شمع، آندھیوں میں فروزاں رہیں گے ہم

جب تک فلک سے ہوں گی حوادث کی بارشیں
ہر حادثے سے دست و گریباں رہیں گے ہم

مل جائے خاک ہی میں نہ کیوں اپنی آبرو
ناموسِ عشق کے تو نگہباں رہیں گے ہم

ہم اُٹھ کے آ سکے نہ درِ نازِ حُسن سے
سجدوں نے جب کہا کہ پریشاں رہیں گے ہم

جب تک نہ عشق و حُسن میں قائم ہو رابطہ
ایک اک نفس میں سلسلہ جنباں رہیں گے ہم

زنداں میں آشیاں کی طرح مدّتوں رہے
اب آشیاں میں صورتِ زنداں رہیں گے ہم

اے آسمان تجھ کو خبر ہو تو کچھ بتا
کب تک رہینِ گردشِ دوراں رہیں گے ہم

بسمل خدا ہی جانے فرشتوں سے کب تلک
شرمندۂ خلافتِ انساں رہیں گے ہم

خموش رات کی عشرت نوائی سُنتا ہوں　　مہ و نجوم کی نغمہ سرائی سُنتا ہوں

تمہارے واسطے میں خود تو کچھ نہیں کہتا　　مگر جو کہتی ہے ساری خدائی سُنتا ہوں

یہ سوچتا ہوں کہ حد بھی ہے کوئی جرأت کی　　جب اُن کے منہ سے جفا کی بُرائی سُنتا ہوں

وہ میری بات پہ دشمن کا ذکر کرتے ہیں　　کہوں جو اپنی تو اُن سے پرائی سُنتا ہوں

اُنھیں کے ظلم کا مارا ہوا زمانہ ہے　　زمانے بھر سے اُنھیں کی دُہائی سُنتا ہوں

تمھاری طرح سے کچّا نہیں ہوں کانوں کا　　میں کب کسی کی لگائی بجھائی سُنتا ہوں

تمھاری بزم میں اچھے ہیں یا بُرے ہیں سب　　یہاں ہر اک سے ہر اک کی بُرائی سنتا ہوں

کچھ اجنبی سا ہے اپنے وجود کا احساس　　صدائیں ساز سے دل کے پرائی سُنتا ہوں

یہ جانتا ہوں کہ اُن دو میں ایک تم ہو گے　　جہاں کسی سے کسی کی لڑائی سُنتا ہوں

بنامِ شعر و سخن کیا کہوں کہ میں بسمل
خدا بچائے جو ہرزہ سرائی سُنتا ہوں

موت کی آرزو نہیں کشمکشِ حیات میں
عشق سے ہیں سہولتیں دہر کی مشکلات میں

عشقِ اداشناس ہے رمزِ تغافل آشنا
آئی ہے اب خصوصیت آپ کے التفات میں

وائے فسردگیٔ روح، ہائے شکستگیٔ دل
ٹیس سی سانس سانس میں ٹھیس سی بات بات میں

حشر کے لاکھ دن بھی ہوں وصل کے تو بھی ہیچ ہیں
دل پہ وہ کچھ گزر گئی ہجر کی ایک رات میں

اُن کو اگر خوشی نصیب ہے، تو وہ کس بنا پہ ہے
اے غمِ عشق تو نہیں جن کے مقدرات میں

بسملؔ اگر ہے مطمئن تو دلِ عشق آشنا
ورنہ سکوں کسے نصیب شورشِ کائنات میں

جستجو ٹھوکریں کھلواتی ہے ‏ ‏ اور منزل پہ بھی پہنچاتی ہے
نا اُمیدی ہے بُری چیز مگر ‏ ‏ ایک تسکین سی ہو جاتی ہے
یاد کرتا ہوں تجھے میں جس وقت ‏ ‏ کیا تجھے بھی مری یاد آتی ہے
دل میں جس بات کا اندیشہ ہو ‏ ‏ ایک دن سامنے آجاتی ہے
انتہا تک وہ سنبھلتا ہی نہیں ‏ ‏ ابتدا جس کی بگڑ جاتی ہے

بسمل اب چھوڑ دو ان باتوں کو
عمر برباد ہوئی جاتی ہے

جا رہا ہے کاروانِ زندگی جانے کہاں — ذہن میں اک راہ ایسی ہے کہ جیسے کہکشاں

جب گزر جاتا ہے سجدوں سے بھی ذوقِ بندگی — خود جبینِ شوق ہو جاتی ہے جذبِ آستاں

آج تک بھی عقل کی اِس رہزنی کے باوجود — عشق ہے منزل بہ منزل کارواں در کارواں

کوئی چیز ایسی ہو آپس میں یہ ٹکرانے نہ پائیں — ایک میخانہ بنے دیر و حرم کے درمیاں

ہم نے ڈالے ہیں وہاں لنگر خدا کے فضل سے — ناخداؤں کے سفینے ڈوب جاتے ہیں جہاں

الحذر، اے عشق تیری زندگی سے الحذر — ہر قدم اک آزمائش، ہر نفس اک امتحاں

دیکھ کر کعبے میں توقیر اپنی اے شیخِ حرم — دیکھ میخانے میں آ کر عظمتِ پیرِ مغاں

اب اِسے معلوم ہوں گے اِس زمیں پر اپنے ظلم — ہونے والا ہے زمیں اب خود یہ ظالم آسماں

جیسے اُن کی یاد میں شامل ہو اپنی یاد بھی — اِس طرح آنے لگی ہے دل میں یادِ رفتگاں

اک کلی اُمید کی مرجھا کے یہ کیا کر گئی — مجھ سے اب دیکھا نہیں جاتا ہے سوئے گلستاں

ایک سنّاٹا سا طاری ہے دلِ ویراں پر اب — جیسے اک سُنسان جنگل، جیسے شہرِ خامُشاں

اب ہمیں بیٹھے کہیں دیکھو تو جیسے نقشِ پا — اور کہیں چلتے کوئی دیکھے تو اک اشکِ رواں

میرے احبابِ وطن کا مجھ سے یہ اصرار ہے — رہ چکے دہلی میں برسوں اب رہو آ کر یہاں

میری یہ حالت کہ گھبراتا ہوں میں یہ سوچ کر — اب یہاں صولتؔ، نہ اب منشی عتیق اللہ خاں

وہ دمِ رخصت کسی کی اک نگاہِ ناتمام
دل میں ٹوٹا ہے وہ اک نشتر کہ بسمل، الاماں

ساقی کے نام لیوا میخانے رہ گئے ہیں　　میخانوں میں بھی خالی پیمانے رہ گئے ہیں

بے مقصدِ جنوں ہیں مجنوں جو دشت میں ہیں　　لیلیٰ نہیں رہی ہے دیوانے رہ گئے ہیں

بن کر جو اک حقیقت دنیا پہ چھا گئے تھے　　دنیا میں آج ان کے افسانے رہ گئے ہیں

محفل رہے تمہاری، محفل میں تم رہو اب　　وہ کیا رہیں جو ہو کر بیگانے رہ گئے ہیں

پہچاننا اب اُن کو دشوار ہو گیا ہے　　جو لوگ اپنے جانے پہچانے رہ گئے ہیں

قبروں میں سونے والو، تم کو پکارتے ہیں　　عشرت کدے جو بن کر غم خانے رہ گئے ہیں

دیکھ اے نگاہِ عبرت، آثارِ عہدِ ماضی　　آبادیوں کے ہو کر ویرانے رہ گئے ہیں

اے گوشِ عبرت، اِن کو تم سن سکو تو سن لو　　یہ کچھ حقیقتوں کے افسانے رہ گئے ہیں

اے شمعِ صبحِ محفل اِن کو جلا کے بجھنا　　دو چار اور تیرے پروانے رہ گئے ہیں

دیوانوں کو جو بسمل بدنام کر رہے ہیں
دیوانوں میں ابھی کچھ فرزانے رہ گئے ہیں

یہاں ہر چیز جنّت کی فراہم ہوتی جاتی ہے
مگر دنیا کو دیکھو تو جہنّم ہوتی جاتی ہے

مُبارک اُن کے حُسنِ عالم آرا کو غرور اپنا
محبت خود ہی اب حُسنِ دو عالم ہوتی جاتی ہے

دعائے مرگِ دشمن پر مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ خود اپنی ہی جیسے زندگی کم ہوتی جاتی ہے

وفائے عشق کی شانہ کشی، متآنگی، برحق
مگر زلفِ جفائے حُسن برہم ہوتی جاتی ہے

فروزاں ہے چراغِ شام کوئی بزمِ عالم میں
کسی شمعِ سحر کی روشنی کم ہوتی جاتی ہے

خدا جانے محبّت کون سے عالم میں لے آئی
طبیعت بے نیازِ ہر دو عالم ہوتی جاتی ہے

کوئی میرے لیے اب در پئے ذلّت نہ ہو بسمل
مری نظروں میں خود عزّت مری کم ہوتی جاتی ہے

نظر آتے ہو تم بہاروں میں — گنگناتے ہو آبشاروں میں

کتنے ہوتے ہیں مختلف انداز — نگہِ ناز کے اشاروں میں

پھول چُن لیں نہ کیوں مُرادوں کے — اِس جوانی کی اِن بہاروں میں

اے خوشا یہ نصیبِ میخانہ — شیخ صاحب ہیں بادہ خواروں میں

شام سے لے کے صبح تک شبِ غم — نظر آتے ہو تم ستاروں میں

لاکھ شمعیں سہی مزاروں پر — روشنی تو نہیں مزاروں میں

جن کو دعوے تھے رہنمائی کے — کھو گئے خود وہ رہگزاروں میں

انقلابِ چمن، خدا کی پناہ — لیں پناہیں گلوں نے خاروں میں

اُن پر الزامِ قتلِ بسمل، حیف
وہ تو بیٹھے ہیں سوگواروں میں

اب عشق رہا نہ وہ جنوں ہے — طوفان کے بعد کا سکوں ہے
احساس کو ضد ہے دردِ دل سے — کم ہو تو یہ جانیے فزوں ہے
راس آئی ہے عشق کو زبونی — جس حال میں دیکھیے زبوں ہے
اک محشرِ اضطراب تھا وصل — اب کچھ تو فراق میں سکوں ہے
تیشہ ہے نفس کا صرفِ کاوش — دل ہے کہ تمام بے ستوں ہے
اِس عشق کے درد کی نہیں حد — کم جانیے جس قدر فزوں ہے
باقی نہ جگر رہا نہ اب دل — اشکوں میں ہنوز رنگِ خوں ہے

اظہار ہے دردِ دل کا بسمل
اِلہام نہ شاعری فسوں ہے

کھوٹا تو کیا، وہ نقد کھرا ہے کہ ہائے ہائے
وہ نا سرہ بھی آج سرا ہے کہ ہائے ہائے

کن مرحلوں میں قافلہ گم ہو کے رہ گیا
کس سمت سے صدائے درا ہے کہ ہائے ہائے

کیا لوگ ہیں یہ لوگ، جہاں کیا جہاں ہے یہ
کیا کارواں ہے کیا یہ سرا ہے کہ ہائے ہائے

اُڑتا ہے اُس ہوا سے بقدرِ نفس جو ہے
تصویر میں وہ رنگ بھرا ہے کہ ہائے ہائے

نغمہ سُنے تو جان کے نوحہ لرز اُٹھے
کتنا یہ دل غموں سے ڈرا ہے کہ ہائے ہائے

کیا دل کا ساتھ تارِ ربابِ نشاط دیں
کس درد سے یہ نغمہ سرا ہے کہ ہائے ہائے

دوشِ وجود پر مرے اِس زندگی کی لاش
کیا ناگوار بوجھ دھرا ہے کہ ہائے ہائے

بسمل کا رنج دل سے بھلایا نہ جائے گا
کس بیکسی کی موت مرا ہے کہ ہائے ہائے

سمجھا ہے کس طرف کو کنارا کہ ہائے ہائے
کس سمت ہے ہے کا یہ دھارا کہ ہائے ہائے

یوں چشمِ التفات نے مارا کہ ہائے ہائے
دیسا گرا ہوں لے کے سہارا کہ ہائے ہائے

کیا پوچھتے ہو میرے سفینے کی واردات
دو ہاتھ رہ گیا تھا کنارا کہ ہائے ہائے

بیمارِ غم کو آئی جو ہچکی اک آخری
اس طرح بیکسی نے پکارا کہ ہائے ہائے

اک ناگوار رسم درہِ عشق کے لیے
کیا کچھ کیا ہے دل نے گوارا کہ ہائے ہائے

کیا دل کی مرگ و زیست میں کچھ فرق ہی نہ تھا
اس طرح مر گیا ہے بچارا کہ ہائے ہائے

جس وقت میرے پاس سے اُٹھ کر چلے ہو تم
دل پر چلا ہے غم کا وہ آرا کہ ہائے ہائے

پڑتے ہی اک نظر تو چکا چوند سی رہی
دیکھا ہی تھا اُدھر کو دوبارا کہ ہائے ہائے

بسمل نہ مل سکا تھا کئی روز سے کہیں
کل یوں ملا وہ عشق کا مارا کہ ہائے ہائے

بڑھ جائیں عدم سے ہم اُدھر اور زیادہ
پائیں جو تری راہ گزر اور زیادہ

بڑھتا ہے فروغ ان کی تجلّی کا جہاں تک
بڑھتی ہے مری تابِ نظر اور زیادہ

ہو جائے جبیں جذبِ درِ ناز الٰہی
جھک جائے درِ ناز پہ سر اور زیادہ

میں حشر کے دن بھی نہ اٹھوں کاش یہاں سے
کچھ دن ہوں ترے در پہ بسر اور زیادہ

اے شامِ غمِ عشق فزوں ہو تری ظلمت
روشن نظر آتی ہے سحر اور زیادہ

کیا دیکھتے ہو در پہ ہجوم اہل جنوں کا
بیٹھے ہیں سرِ راہ گزر اور زیادہ

اندیشۂ رسوائی توجہ میں تو کم ہے
پھیلے گی تغافل سے خبر اور زیادہ

اِن شمس و قمر سے جو گزرتی ہیں نگاہیں
آتے ہیں نظر شمس و قمر اور زیادہ

پردے کے لئے بند نہ چاہو مری آنکھیں
اِس طرح تو آتے ہو نظر اور زیادہ

دیکھا ہے رہِ ترکِ محبت پہ بھی چل کر
دشوار ہے یہ راہ گزر اور زیادہ

کس درجہ المناک ہیں شام و سحرِ عشق
شام اور زیادہ ہے سحر اور زیادہ

بسمل جو کہیں دیکھتے قدر اپنے ہنر کی
کرتے ہم ابھی عرضِ ہنر اور زیادہ

جب محبّت اور وفا کی اتنی ارزانی نہ تھی
اُن دنوں میں تو یہ دُنیا اِس قدر فانی نہ تھی

ہو گیا مشکل مریضِ عشق کو دم توڑنا
آپ کو اِس وقت میں تکلیف فرمانی نہ تھی

جُھک گیا پلہ مری فردِ عمل کا روزِ حشر
نامۂ اعمالِ زاہد میں پشیمانی نہ تھی

کچھ تو آسانی بھی مشکل ہو گئی تھی عشق میں
کچھ مری مشکل کو بھی منظور آسانی نہ تھی

تھا یہی صحرا، یہی وادی، یہی وحشت، مگر
قیس کے آنے سے پہلے اتنی ویرانی نہ تھی

عشق کی نظروں میں جب ایسی نہ تھیں گستاخیاں
حُسن کے جلوؤں میں بھی تو اِتنی عُریانی نہ تھی

عشق رکھ سکتا تھا اُس جلوے کا پردہ کس طرح
حُسن کی جانب سے خود جس کی نگہبانی نہ تھی

اُس زمانے کا ورق تاریخِ انساں میں نہیں
جس زمانے میں محبّت کی جہاں بانی نہ تھی

میں تو بسمل اُس نگاہِ عشق پر قربان ہوں
جس سے پہلے حُسن کے جلوؤں میں تابانی نہ تھی

بیٹھا نہیں ہوں سایۂ دیوار دیکھ کر
ٹھہرا ہوا ہوں وقت کی رفتار دیکھ کر

ہم مشربی کی شرم گوارا نہ ہو سکی
خود چھوڑ دی ہے شیخ کو میخوار دیکھ کر

کیا دیکھتا ہے اے دلِ مشتاقِ دید اب
ہم نے تو کہہ دیا تھا، خبردار، دیکھ کر

آنے لگی ہے عشق کو غیرت پر اپنی شرم
شاید تری نگاہ کو بیزار دیکھ کر

کیا کیا فریبِ عقل دیے ان کی بزم نے
میرے جنوں کو محرمِ اسرار دیکھ کر

کیا جانے بحرِ عشق میں کتنے ہوئے ہیں غرق
ساحل سے سطحِ آب کو ہموار دیکھ کر

دنیا کی زندگی کا تصور ہے صبحِ حشر
جاگا ہوں خود کو خواب میں بیدار دیکھ کر

ہیں آج تک نگاہ میں، حالانکہ آج تک
دیکھا نہ پھر کبھی انھیں اک بار دیکھ کر

دستِ دغا سے دامنِ دل کو چھڑا لیا
اہلِ ہوس نے عشق کو دشوار دیکھ کر

بسملؔ تم آج روتے ہو انجامِ عشق کو
ہم کل سمجھ گئے تھے کچھ آثار دیکھ کر

مُسلسل
غزلیں

جب سے مری نظر میں سمائے ہوئے ہو تم — ہر مرکزِ نگاہ پہ چھائے ہوئے ہو تم

مقصود جس کا کوئی تمہارے سوا نہیں — وہ راہ زندگی کو دکھائے ہوئے ہو تم

کر کے شریکِ ذہن مرے، اپنا اک خیال — ہر فکرِ ماسوا سے بچائے ہوئے ہو تم

روشن ہوئے نہ تھے جو تمہارے جمال سے — وہ سب چراغِ شوق بجھائے ہوئے ہو تم

ہر راہِ زندگی میں اُسی کی ہے روشنی — دل میں جو ایک شمع جلائے ہوئے ہو تم

گلشن کے حسن میں مُتبسّم بہار ہے — یا مسکرا کے سامنے آئے ہوئے ہو تم

ہے اختلافِ رنگ میں تم سے مناسبت — پھولوں کی انجمن کو سجائے ہوئے ہو تم

ذکرِ نشاطِ خُلد پہ ہنستا ہے میرا دِل — اس غم کدے کو جب سے بسائے ہوئے ہو تم

بن جائے گا یہی تو قیامت کا زلزلہ — دِل میں جو ایک حشر اُٹھائے ہوئے ہو تم

اب کیا کسی کی سمت اُٹھے گی مری نگاہ — میری طرف نگاہ اُٹھائے ہوئے ہو تم

مشتاقِ باز دید ہے وہ بسملِ حزیں
اک بار جس کے سامنے آئے ہوئے ہو تم

سمجھ سکے گا کوئی کیونکر اس کی بربادی
اگر کسی کے کرم کا ہو کوئی فریادی
یہ کیا کیا تری تسکینِ نا مُکمّل نے
سُلگ رہی تھی جو دل میں وہ آگ بھڑکا دی
قبولِ عرضِ تمنا ارے خدا کی پناہ
سکونِ دل کے بہانے سے رُوح تڑپا دی
کسی سے وعدۂ فردا کرے ہی کیوں کوئی
نصیبِ وعدۂ فردا نہ ہو جو آزادی
زہے کرشمۂ تقریر و لذّتِ تقریر
اُلجھ گیا ہوں اُسی میں جو بات سمجھا دی
گزر سکے نہ کسی طرح زندگی بسملؔ
ذرا سی دیر کو یوں زندگی گزرا دی

گرویدہ مجھے اپنا بنایا تھا تمہیں نے
یہ دام محبّت کا بچھایا تھا تمہیں نے

تھا شوق مجھے تم سے ملاقات کا لیکن
میں خود نہیں آیا تھا بلایا تھا تمہیں نے

مدّت سے مرے دل میں وفا سوئی ہوئی تھی
یہ فتنۂ خوابیدہ جگایا تھا تمہیں نے

میں عشق و محبّت کا سبق بھول چکا تھا
مجھ کو یہ سبق یاد دلایا تھا تمہیں نے

بڑھ کر تو میں پھر تم سے محبّت میں رہا ہوں
اوّل تو محبّت کو بڑھایا تھا تمہیں نے

جس دن مجھے آئی تھی ہنسی عہدِ وفا پر
اُس دن مجھے رو رو کے رُلایا تھا تمہیں نے

اب جیسے کبھی ختم ہی لَے اس کی نہ ہوگی
نغمہ وہ مرے سامنے گایا تھا تمہیں نے

جس سلسلۂ عشق کا یہ حشر ہوا ہے
وہ سلسلۂ شوق بڑھایا تھا تمہیں نے

ہے جس پہ گراں میرے سلاموں کا جواب اب
وہ ہاتھ مری سمت بڑھایا تھا تمہیں نے

ق

میں یاد دلاتا ہوں اگر بھول گئے ہو
اک رنج مرے دل سے بھلایا تھا تمہیں نے

جس تجربۂ عشق پہ رویا تھا میں اک روز
ہنس کر اُسے باتوں میں اُڑایا تھا تمہیں نے

اب یاد وہ آتا ہے تمہارے ہی سبب سے
حالانکہ اُسے دل سے بھُلایا تھا تمہیں نے

آزردۂ انجام وہ بسمل ہے تمہیں سے
آغاز میں مُنہ جس کو لگایا تھا تمہیں نے

خدا کرے مجھے دم بھر کوبھی نصیب نہ ہو
وہ زندگی جسے تیری خوشی نصیب نہ ہو

ترے لئے ہی نہ ہو زندگی و موت اگر
تو زندگی ہی نہیں موت بھی نصیب نہ ہو

جو سر جھکا ہو کہیں تیرے آستاں کے سوا
مری جبیں کو تری بندگی نصیب نہ ہو

کبھی اٹھی ہو جو ہنستی ہوئی بہار کی سمت
مری نگاہ کو تیری ہنسی نصیب نہ ہو

اگر پیا ہو کسی چشمِ مست کا ساغر
تری نظر سے مجھے مے کشی نصیب نہ ہو

اگر ہوا ہوں میں آلودۂ شباب کہیں
ترے جمال کی پاکیزگی نصیب نہ ہو

سکوں نصیب ہوا ہو کبھی جو تیرے بغیر
خدا کرے کہ مجھے تو کبھی نصیب نہ ہو

اگر نہ ہو تری خاطر سے پاسِ دشمن بھی
خدا کرے کہ تری دوستی نصیب نہ ہو

جو تیرے غم پہ لٹا دوں نہ ہر خوشی اپنی
خدا کرے مجھے کوئی خوشی نصیب نہ ہو

خدا سے تیرے سوا اور کچھ اگر مانگوں
خدا کرے کہ مجھے بھیک بھی نصیب نہ ہو

اگر نہ ہو تری تصویر مونسِ بسملؔ
تو بدنصیب کو صورت تری نصیب نہ ہو

اپنے وعدوں کو فراموش نہ کر دینا تھا
سازِ الطاف کو خاموش نہ کر دینا تھا

اپنی نظروں سے اگر مجھ کو کیا تھا اوجھل
اپنے دل سے تو فراموش نہ کر دینا تھا

نہیں آتا تھا اگر ہوش میں لانا تم کو
کسی کم بخت کو بے ہوش نہ کر دینا تھا

ہر نفس موت کے قدموں کی صدا سننے کو
زندگی کو ہمہ تن گوش نہ کر دینا تھا

آنسوؤں میں فقط اب مجھ کو نظر آتے ہو
اس طرح تو مجھے غم کوش نہ کر دینا تھا

نہ اُٹھانا تھا درِ میکدۂ ناز سے اب
ورنہ پہلے مجھے مے نوش نہ کر دینا تھا

اس طرح زحمتِ فردا کو بڑھانے کے لئے
مجھ کو خمیازہ کشِ دوش نہ کر دینا تھا

آنکھ میں دیکھ کے آنسو مجھے رشک آتا ہے
اتنا ویران تو آغوش نہ کر دینا تھا

دفترِ ناز پہ کچھ بار نہ تھا اس کا نیاز
اپنے بسمل کو سبکدوش نہ کر دینا تھا

جب سے جانِ آرزو پہلو سے تُو جاتا رہا
دِل کی فِطرت سے مذاقِ آرزو جاتا رہا
اِک تری جانب سے کیا محرومِ نظّارہ ہوئیں
میری نظروں کا بہشتِ چار سو جاتا رہا
صُبح کا وہ منظرِ باغ و بہاراں مِٹ گیا
شام کا نظّارۂ جام و سبو جاتا رہا
تُجھ سے محرومِ تکلّم ہو کے اوروں سے تو کیا
اپنے دل سے بھی تو لُطفِ گفتگو جاتا رہا
تجھ سے بھی بچ بچ کے تجھکو کر رہا ہوں یوں تلاش
تُو یہ سمجھے اب جنونِ جستجو جاتا رہا
اَب بھی تیری تیغِ ابرو کا میں بسمل ہوں مگر
اب وہ ربط و ضبطِ شمشیر و گلو جاتا رہا

وقف کر کے زِندگی کی ساعتیں تیرے لئے
اپنے سر لیں میں نے کیا کیا آفتیں تیرے لئے

کر لیا نظّارۂ حُسن اپنی آنکھوں پر حرام
میں نے رَد کر دیں نظر کی دعوتیں تیرے لئے

بیٹھ کر تیری گلی میں بیٹھنے والوں کے پاس
خاک کر لیں اپنی شخصی عظمتیں تیرے لئے

اپنی عزّت آپ کرنے کا بھی جن کو حق نہیں
کی ہیں اُن لوگوں کی میں نے عزّتیں تیرے لئے

اپنی خدمت جن سے لینے میں شرافت کو ہو عار
کی ہیں ان لوگوں کی میں نے خدمتیں تیرے لئے

تیرے قدموں کے سوا اُن کی تلافی ہی نہیں
میں نے جو برداشت کی ہیں ذِلّتیں تیرے لئے

جن میں ہوتا تھا مرے دل پر نزولِ وحیٔ شعر
وقفِ آہ و نالہ ہیں وہ ساعتیں تیرے لئے

کاش تُو لکھّے کہ بسملؔ کچھ خبر بھی ہے تجھے
کس قدر غم گیں ہیں میری خلوتیں تیرے لئے

"مبتلائے غمِ دلِ ناکام ہے تیرے بغیر
زندگی آلام ہی آلام ہے تیرے بغیر

عشق میں ہر شام ہے بے صبح تیرے ہجر کی
زندگی کی ہر سحر بے شام ہے تیرے بغیر

تیرے پہلو کے سوا آرام ممکن ہی نہیں
دِل کچھ اس پہلو سے بے آرام ہے تیرے بغیر

موت کو بھی جو گوارا ہو نہ اپنے واسطے
زندگی مجھ پر وہ اک الزام ہے تیرے بغیر

آہ، اُس عالم میں اک میرے سِوا کوئی نہیں
ہائے وہ عالم کہ جس کا نام ہے تیرے بغیر

چاہیئے اک عمر جس کے عالمِ سکرات کو
ہر نفس اُس موت کا پیغام ہے تیرے بغیر

دِل نہیں ہے تیری فرقت میں ہے اک ماتم کدہ
آرزوؤں میں بپا کہرام ہے تیرے بغیر

ذوقِ بیداری بجز خوابِ پریشاں کچھ نہیں
خواب گویا اک خیالِ خام ہے تیرے بغیر

اب بھی تو آجائے تو باقی ہے تابِ ضبطِ آہ
ورنہ رازِ عشق طشت از بام ہے تیرے بغیر

دستِ رنگیں سے ترے لبریز جو پاتا تھا میں
آج ساقی تشنہ لب وہ جام ہے تیرے بغیر

جرأتِ گستاخ تو بہ کھینچتی ہے اپنی سمت
دامنِ تر جامۂ احرام ہے تیرے بغیر

دوستوں کا خیر مقدم بھی ہے دل کو ناگوار
ہر صدائے مرحبا دشنام ہے تیرے بغیر

منفعل جو اک خُدا کے بھی تصوّر سے نہ تھا
اب وہ دل شرمندۂ اوہام ہے تیرے بغیر

جس کے دل پر عرش اُتر آتا تھا بن کر شعرِ تر
اب وہ بسمل تشنۂ الہام ہے تیرے بغیر

تم اپنے قول تم اپنے قرار یاد کرو
اور اُن پہ پھر وہ مرا اعتبار یاد کرو

جو مجھ پر اب نہ رہیں اُن نوازشوں کی قسم
نوازشوں کے وہ لیل و نہار یاد کرو

تمام دن مری حسرت میں روزنِ در سے
نگاہِ شوق سوئے رہ گزار یاد کرو

وہ شرم و شوق کے ہیجان میں شبِ مہتاب
تمام رات مرا انتظار یاد کرو

ذرا خلافِ توقع مرے پہنچنے پر
وہ طرزِ گفتگو بیگانہ وار یاد کرو

وہ ہر نظر میں مجھے اک پیامِ جرأتِ شوق
وہ ہر نظر کی ادا شرمسار یاد کرو

ہزار بار قبول ، ایک بار عرضِ کرم
ہزار بار نہیں ایک بار یاد کرو

کبھی وہ آپ ہی مجبور ہو کے رہ جانا
کبھی وہ مجھ پہ بھی اک اختیار یاد کرو

کبھی سکوتِ مسلسل کسی خیال میں غرق
کبھی وہ پھر نفسِ بار بار یاد کرو

کبھی وہ گریۂ بے اختیار بھول گئے
کبھی وہ خندۂ بے اختیار یاد کرو

ذرا سکوت پہ میرے وہ سو توہّم سے
مری طرف نگہِ بے قرار یاد کرو

گلے سے پھولوں کے گجرے اُتار پھینکے تھے
مری نظر میں تم اپنی بہار یاد کرو

سنہری کرنوں سے جن میں بھرا تھا چاندنے رنگ
محبتوں کے وہ نقش و نگار یاد کرو

مری طرف سے بھی تسکین زہر تھی جس میں
وہ اضطرابِ دلِ بے قرار یاد کرو

جو میرے شانوں پہ گرتے تھے مست آنکھوں سے
شرابِ شوق کے وہ آبشار یاد کرو

مری خوشی سے نہ پی کر کبھی پھر مری خاطر
اَدا سے برلبِ پیمانہ پیار یاد کرو

دمِ وداع وہ ارمانِ بازدید وہ شوق
سُرور سے بھی زیادہ خمار یاد کرو

مری جُدائی گوارا ہوئی تمہیں کیوں کر
تمہیں یہ ذکر بھی تھا ناگوار یاد کرو

تم اب کہاں ہو، کہاں ہے قرارِ دل کا مرے
بنے تھے تم مرے دل کا قرار یاد کرو

خُدا کرے کبھی بے اختیار یاد آؤں
خُدا کرے کبھی بے اختیار یاد کرو

بُھلا چکے سو بُھلا ہی چکے وہ اب بسمل
ہزار یاد دلاؤ ہزار یاد کرو

جفا نا آشنا رہنا وفا نا آشنا رہنا
ابھی دیکھا نہیں تم نے محبّت کا خفا رہنا

محبّت ہی ہزاروں مدّعاؤں سے عبارت ہے
محبّت ہی مگر ہے بے نیازِ مدّعا رہنا

نہیں ہے تمکو دل کی وسعتوں کا علم ابھی شاید
محبّت میں ہے ممکن حُسن سے بھی ماورا رہنا

محبت کی نزاکت کی قسم اکثر محبّت میں
گزرتا ہے گراں دل کو بھی اپنا مبتلا رہنا

تمہاری بے نیازی ہی نے مجھکو بھی سکھایا ہے
تمہارے پاس ہی رہنا مگر تم سے جُدا رہنا

مرے دستِ طلب، میری نگاہِ شوق سے پوچھو
نہ مصروفِ دُعا رہنا نہ صرفِ التجا رہنا

وہ تاریخِ محبت ہے ابھی محفوظ جس میں ہے
دیارِ آرزو میں حُسن کا بے دست و پا رہنا

نہ دیکھا جائے میرے عشق سے لیکن یہ ہونا ہے
تمہارے حُسن کا بیگانۂ ناز و ادا رہنا

تمنا بھی محبّت تھی مگر دل نے کہا بسمل
محبّت بن کے جب رہنا تمنا بن کے کیا رہنا

گو بے نیازِ حسرت و ارماں نہیں ہوں میں
لیکن فریب خوردۂ پیماں نہیں ہوں میں

ہر چند اس ستم کا بھی شکوہ نہیں مجھے
لیکن اب اُس کرم کا بھی خواہاں نہیں ہوں میں

دل کو سکونِ یاس گوارا نہیں مگر
اَب اِضطرابِ شوق کے شایاں نہیں ہوں میں

ہیں دل کو شاق تیری کم آمیزیاں مگر
شکوہ گزارِ جورِ فراواں نہیں ہوں میں

اپنی وفا سے لاکھ پشیمانیاں سہی
لیکن تری جفا سے پشیماں نہیں ہوں میں

کرتا ہوں تیرے عشق کی اب بھی حفاظتیں
حالانکہ آپ اپنا نگہباں نہیں ہوں میں

قائم مزاجِ عشق ہوا ہے کچھ اس طرح
خنداں اگر نہیں ہوں تو گریاں نہیں ہوں میں

اب تک بھی خاکِ راہ ہوں تیرے لئے مگر
اندیشہ مندِ جنبشِ داماں نہیں ہوں میں

ارمانِ مہربانی و احساں کے باوجود
خواہانِ مہربانی و احساں نہیں ہوں میں

تیرے لائق مرے ارمانِ کرم ہیں کہ نہیں
ذرّہ ور پر توِ خورشید بہم ہیں کہ نہیں

نگہِ شوق کے سجدے مرے پھر کفر ہوں کیوں
تیرے ابرو بھی تو محرابِ حرم ہیں کہ نہیں

اپنی گستاخیٔ سجدہ مجھے تسلیم، مگر
تیری سرکار میں سر اور بھی خم ہیں کہ نہیں

چند ذرّوں پہ نشانات جبیں کے بھی سہی
کوچۂ ناز میں کچھ نقشِ قدم ہیں کہ نہیں

مے کدہ بھی سہی منجملۂ اربابِ نیاز
ناز بردار ترے دیر و حرم ہیں کہ نہیں

سوئے اخلاصِ محبّت بھی کبھی گوشۂ چشم
رابطے مصلحتوں سے بھی بہم ہیں کہ نہیں

وقت کا تاج سدا سر پہ رہا ہے کس کے
ہاں سرافراز ترے زیرِ قدم ہیں کہ نہیں

جلوتِ عام ہے بے رنگِ بہارانِ طرب
خلوتِ خاص میں اندازِ ارم ہیں کہ نہیں

حُسنِ سادہ بھی خود اک شعر ہے، اک شعرِ حسیں
مگر اس شعر میں کچھ پہلوئے ذم ہیں کہ نہیں

اے ہمہ مہر و وفا، مرحمت و لطفِ تمام
ہیں جو اوروں پہ کرم مجھ پہ ستم ہیں کہ نہیں

آنے والا کوئی خاکم بدہن ہے تو سہی
نگراں جانبِ در دیدۂ نم ہیں کہ نہیں

ہیں تری زُلف کے خم عقدہ کشائے قسمت
میری قسمت کے تری زلف میں خم ہیں کہ نہیں

کاش اس بے کسیٔ شوق پہ تُو مجھ سے کہے
دیکھ بسمل کہ ترے واسطے ہم ہیں کہ نہیں

زمین عشق ہے ، عشق آسمان ہے گویا!
غرض کہ عشق ہی سارا جہان ہے گویا
بغیرِ آرزو . کیا زندگی محبّت کی
کہ آرزو ہی محبّت کی جان ہے گویا
وہی زمین . وہی آسمان ہے لیکن
نہ وہ زمین ، نہ وہ آسمان ہے گویا
اگر میں دل ہوں ، مری آرزو ہے تیری ذات
اگر میں جسم ہوں تُو میری جان ہے گویا
اِدھر اُدھر مری آنکھیں تجھے پکارتی ہیں
مری نگاہ نہیں ہے زبان ہے گویا

تِرا ہی نام نِکلتا ہے، جس کو دُوں آواز
کوئی خیال ہو، تیرا ہی دِھیان ہے گویا

گئے ہو جب سے تُم اِس گھر سے کُچھ یہ عالم ہے
کہ گھر کے گھر میں ہر اک میہمان ہے گویا

گذر رہی ہے مری اِس طرح زمانے میں
زمانہ مجھ پہ بہت مہربان ہے گویا

عیاں ہے عبرتِ دوش، اور حسرتِ فردا
زبانِ حال پہ میرا بیان ہے گویا

کہاں تک آہ، یہ ہر جہدِ زندگی ناکام
جگر میں تاب، نہ اب دِل میں جان ہے گویا

کچھ ایسا بار ہوا ہوں میں دوشِ ہستی پر
کہ ہر جنازے پر اپنا گُمان ہے گویا

کچھ اِس خوشی سے بڑھا جا رہا ہوں موت کی سمت
کہ آہ موت بھی اک امتحان ہے گویا

اِسی زمین سے میرا خمیر ہے، لیکن
مِرے لئے یہ زمین، آسمان ہے گویا

جُدا کیا ہے اُسی نے، وہی ملائے گا
مِرے تمہارے خدا درمیان ہے گویا

وہ بے دلی سی محبت میں دل پہ چھائی ہے
کہ شوقِ وصل نہ اب کاہشِ جدائی ہے
نہ اب ملالِ ستم ہے نہ اب خیالِ کرم
خدا ہی جانے مرے دل میں کیا سمائی ہے
مذاقِ کوچہ نشینی نہ آستاں بوسی
وہ ذوقِ دید نہ اب شوقِ جبہ سائی ہے
اب اضطرابِ تمنّا سے ہے سکوں دل کو
سکون بن کے مرے دل کی موت آئی ہے
گناہِ شوق کی توفیق دے خدائے عشق!
خدائے عشق! دُہائی تری دہائی ہے
کچھ ایسے عالمِ بیگانگی میں ہوں بسمل
کہ جیسے جان بھی اپنی نہیں پرائی ہے

وعدہ خلافِ وعدۂ فردا کب آئے گا
یارب وہ میرا بھولنے والا کب آئے گا

جانِ ادا و نازِ سراپا کب آئے گا
میری طرف نہ دیکھنے والا کب آئے گا

دل ہے بجھا بجھا سا تمنّا اُداس اُداس
وہ جانِ دل وہ جانِ تمنّا کب آئے گا

کب تک رہے گا سلسلۂ اشکِ متّصل
اِن آنسوؤں کا پونچھنے والا کب آئے گا

ہنس ہنس کے لوگ دیکھیں گے کب تک مری طرف
وہ مسکرا کے دیکھنے والا کب آئے گا

اِس میری جاں کنی کی قسم تجھ کو اے صبا
اُس جانِ انتظار سے کہنا کب آئے گا

بسملؔ پھر آئے گا وہ ضرور آئے گا مگر
اب اُس کو یاد وعدۂ فردا کب آئے گا

شبِ غم عیش کا مژدہ سُنانے کون آتا ہے
یہ میرے آنسوؤں میں مُسکرانے کون آتا ہے

ٹھہر سکتا نہیں سینے میں جب دل مضطرب ہوکر
سُکوں بن کر مرے پہلو میں جانے کون آتا ہے

کُچل دیتی ہے جب اِحساس کو سنجیدگی غم کی
شرارت سے مرا دل گدگدانے کون آتا ہے

بھیانک تیرگی میں غم کی جب دَم گُھٹنے لگتا ہے
چراغِ کشتۂ عشرت جلانے کون آتا ہے

شبِ غم دِل پہ چھا جاتا ہے جب اک حُزنِ بیخوابی
نشاطِ رُوح بن بن کر سُلانے کون آتا ہے

وفورِ یاس کر دیتا ہے جب لبریزِ غم دِل کو
خوشی بن کر مرے دل میں سمانے کون آتا ہے

اَجل کے تیز قدموں کی جب آہٹ آنے لگتی ہے
باندازِ مسیحائی سرہانے کون آتا ہے

مرا دِل ڈوبنے لگتا ہے جب غم کے سمندر میں
مِری کشتی کو ساحل سے لگانے کون آتا ہے

بقولِ حضرتِ نوابِ ممتاز[۱] آجکل بسمل
"تصوّر میں مرے اللہ جانے کون آتا ہے"

---

[۱] ممتاز الدولہ نواب محمد مُکرّم علی خاں آف پہاسو۔

وہ، جِس کے ہم کو کچھ ایسے ستم نصیب ہوئے
کِسی کو ایسے کرم بھی تو کم نصیب ہوئے
ہُوئے تمام سِتم شاملِ شُمارِ کرم
سِتم کے بعد کچھ ایسے کرم نصیب ہوئے
خوشی بھی ایسی کِسی کو نہ مِل سکی ہوگی
کہ جیسے ہم کو محبّت میں غم نصیب ہوئے
وہ جِس کے عارض و کاکُل کے مَست نظّارے
شروعِ شام سے تا صبح دَم نصیب ہوئے
وہ جِس کے حُسن میں عالم ہمارے عشق کا تھا
ہوا وہ ہم کو نصیب اُس کو ہم نصیب ہوئے

وہ جس کی خوئے تلوّن سے بارہا ہم کو
نصیبِ غیر کے قول و قسم نصیب ہوئے

ہُوا ہو جذب ہر اک جیسے اپنی ہستی میں
ہم ایک دوسرے کو یوں بہم نصیب ہوئے

وہ لُطف جِس نے کئے جو نصیب میں بھی نہ تھے
جو بے نوشتۂ لوح و قلم نصیب ہوئے

زہے نصیب کہ مُدّت کے بعد نظروں کو
پھر آج اُس کے سجودِ قدم نصیب ہوئے

نِگاہِ شوق بہ ہر گام سجدہ ریز رہی
نِگاہِ شوق کو کتنے حرم نصیب ہوئے

نظر پڑی تو کچھ اس طرح ڈگمگائے قدم
نظر کو نغموں کے کچھ زیر و بم نصیب ہوئے

رہے وہ نقشِ کفِ پائے رہگذارِ چمن
بہارِ باغ کو جیسے اِرم نصیب ہوئے

پھر میں ہوں اور وہی کرمِ التفات ہے — زیرِ نگینِ شوق وہی کائنات ہے
پھر ہر نفس ہے اور وہی ذوقِ حیات ہے — پھر زندگی ہے اور غرورِ ثبات ہے
حسبِ مُرادِ دِل ہیں زمانے کی کروٹیں — پھر آرزو کا دن ہے تمنّا کی رات ہے
پھر حُسن سامنے ہے جدھر دیکھتا ہوں میں — پھر کائناتِ شوق بہشتِ جہات ہے
پھر ہر معاملہ ہے کہے بِن سُنے بغیر — پھر ایک جان اور دو قالب کی بات ہے
لطفِ صفاتِ عشوہ و نازو ادا کے ساتھ — شوقِ تمام، خلوتیٔ حُسنِ ذات ہے
پھر ہے بساطِ عیش پہ بازی مُراد کی — پھر آرزو کی جیت ہے حسرت کو مات ہے
جامِ مئے نشاط میں دنیا و دیں ہیں غرق — اندیشۂ مآل نہ فکرِ نجات ہے
پھر فیضِ کُفرِ حُسن سے ہے مستفید عشق — حسبِ قدیم کعبۂ دل سومنات ہے

ہے گردشِ زمانہ مرے زیرِ اقتدار
بسمل عنانِ دہر پہ پھر میرا ہات ہے

حسبِ مرادِ عشق زمانہ ہے آج کل — دل کامیابِ ذوقِ تمنا ہے آج کل

اک عالمِ نشاطِ مسلسل ہے زندگی — امروز ہے نہ دوش نہ فردا ہے آج کل

جن کے لئے بنا تھا زمانہ وہ دن ہیں یہ — جواب نہ جائے گا وہ زمانہ ہے آج کل

اللہ رے غرور دماغِ نشاط کا — پامالِ شوق عالمِ بالا ہے آج کل

خُم سے بھی کچھ سوا نظر آتی ہے جام میں — کیا اہتمام ساغر و مینا ہے آج کل

انگڑائیاں ہیں حُسن کی پہلوئے شوق میں — آغوش میں شباب مچلتا ہے آج کل

ہر عشوہ حسیں میں چمکتا ہے رنگِ عشق — ہر آرزو پہ حُسن برستا ہے آج کل

ہر زیر و بم میں کیف و کمِ عشق ہے نہاں — پیدا وہ سازِ حسن سے نغمہ ہے آج کل

وابستگیِ زلف کا اللہ رے سلسلہ — ہر سانس عمرِ خضر و مسیحا ہے آج کل

یہ میری دستبرد سے باہر نکل نہ جائے — میری طرف سے موت کو دھڑکا ہے آج کل

پرسانِ حالِ شوق ہے وہ چشمِ منفعل — کس کو خیالِ پرسشِ عقبیٰ ہے آج کل

دنیا میں دو دلوں کو ہے ملنا کہاں نصیب — جس پر فدا ہو دین وہ دنیا ہے آج کل

معراجِ زندگی ہے نصیب نمازِ شوق
دامانِ نازِ حُسن مُصلّےٰ ہے آج کل

اے ہم نشیں نہ پوچھ وہ کیفیّتِ نَشاط ۔۔۔ باہمدگر جو دل دہی و دلبری رہی
اُن کا جمال اور مرے آغوشِ شوق میں ۔۔۔ ذرّے کو بل کے مہر کی تابندگی رہی
طغیانِ ناز و عشوہ و انداز الاماں ۔۔۔ کشتیِ شوق ساحلِ دِل پر رُکی رہی
میری نِگاہِ شوق بھی شرما کے رہ گئی ۔۔۔ کچھ یوں وہ چشمِ ناز مجھے دیکھتی رہی
اس طرح جذبِ روح ہوئی وہ نگاہِ ناز ۔۔۔ رگ رگ میں پھُلجھڑی سی کوئی چھوٹتی رہی
محجوب مجھ کو شوقِ فراواں پہ دیکھ کر ۔۔۔ خود طبعِ نازنیں پہ گراں نازُکی رہی
یہ سوچ کر کہ فرطِ طرب سے یہ مر نہ جائے ۔۔۔ پنہاں سپردگی میں بھی پہلو تہی رہی
اک موجِ بوئے گل تھی کہ لہجے کا لوچ تھا ۔۔۔ جس میں شراب اور بھی رس گھولتی رہی
بہکے ہوئے وہ لفظ لبِ نازنیں پہ ہائے ۔۔۔ معنے پہ جن کے چھائی ہوئی خامشی رہی
حالانکہ چاند رات بھر اس شب نہ رہ سکا ۔۔۔ اُن پر تمام رات مگر چاندنی رہی
صُبحِ حریمِ حُسن کی کیفیتیں نہ پُوچھ ۔۔۔ چھائی ہوئی فضاؤں پہ وارفتگی رہی
سب ہو گئی تھی جذب اُن آنکھوں میں بن کے نیند ۔۔۔ تاروں میں آسماں پہ نہ کچھ روشنی رہی
جب تک وہ محوِ خواب رہے گل نہ ہنس سکے ۔۔۔ طاری تمام باغ پہ اک خامشی رہی
بیداریِ شباب کے انداز کیا کہوں ۔۔۔ کیفیتِ شگفتگی و غنچگی رہی
اُٹھ کر وہ خوابِ ناز سے کچھ اس طرح چلے ۔۔۔ موجِ نسیمِ صبح قدم چومتی رہی
گل رنگ رُخ پہ تھی وہ صباحت کی اک جھلک ۔۔۔ صُبحِ بہارِ باغ بھی منہ دیکھتی رہی

زلفِ سیاہ عارضِ تاباں پہ دیکھ کر — صحنِ چمن پہ مست گھٹا جھولتی رہی

میری نگاہِ شوق کو اس رُخ پہ دیکھ کر — شبنم کو برگِ گُل سے کرن چوستی رہی

انفاس میں شراب کی خوشبو کو دیر تک — دیوانہ وار نکہتِ گُل سُونگھتی رہی

ہر چشمِ ناکشودہ بھی مشتاقِ دید تھی — دِل سے ہر اک کلی کے کرن پھوٹتی رہی

بسملؔ اُٹھیں نہ ان کی نگاہیں کسی طرف
پھولوں کی جلوہ گاہ اُنہیں دیکھتی رہی

تھی کس کو خبر غم میں بسر ہو کے رہے گی
اک دن شبِ عشرت کی سحر ہو کے رہے گی

معلوم نہ تھا آہ کہ جو راحتِ دل ہے
اک دن وہ نظر دردِ جگر ہو کے رہے گی

رکھتی تھی مری راتوں کو روشن جو تجلّی
وہ شمعِ شبستانِ دگر ہو کے رہے گی

پھیری تھی نظر جس کے لئے میں نے ہر اک سے
برگشتہ مجھی سے وہ نظر ہو کے رہے گی

سمجھا تھا نہ میں عشرتِ رفتہ کی یہ تاثیر
ہر عیش میں اندوہ اثر ہو کے رہے گی

نغمات کی لَے نالۂ شب گیر بنے گی
آوازِ رباب آہِ سحر ہو کے رہے گی

ہو جائیں گے مایوسِ صدا گوشِ تمنا
نظّارے سے محروم نظر ہو کے رہے گی

تھی حسن کی تابش سے جو نمناکِ مسرّت
وہ آنکھ کبھی اشک سے تر ہو کے رہے گی

ہر لمحے میں جس رات کے اِک نورِ سحر تھا
اُس رات کی تاریک سحر ہو کے رہے گی

معلوم نہ تھا آہ محبّت میں کہ بسمل
دُنیا مری یوں زیر و زبر ہو کے رہے گی

غیر ممکن بھی ہے ممکن مجھے معلوم نہ تھا
ایک دِن آئے گا یہ دن مجھے معلوم نہ تھا

اور کچھ میں ترے ظاہر سے سمجھتا تھا تجھے
اور کچھ ہے ترا باطن مجھے معلوم نہ تھا

اپنے دامانِ تصنّع میں چھپا سکتے ہیں
اِن معائب کو محاسن مجھے معلوم نہ تھا

دشمنی کے لئے مخصوص ہے جو طرزِ عمل
دوستی میں بھی ہے ممکن مجھے معلوم نہ تھا

آہ، ہو سکتی ہے بیداد پہ مائل وہ نظر
ہو جو الطاف کی ضامن مجھے معلوم نہ تھا

عمر بھر صبر نہ آئے گا مجھے جس کے بغیر
چین پائے گا وہ مجھ بن مجھے معلوم نہ تھا

باہمہ گرمیِ دل نبضِ محبّت اِک دن
ہو کے رہ جائے گی ساکن مجھے معلوم نہ تھا

آہ اِس عمرِ محبّت میں کبھی اے بسمل
ایک دن آئے گا یہ دن مجھے معلوم نہ تھا

حریمِ حُسن سے میں بے وقار ہو آیا
نگاہِ عشق میں بے اعتبار ہو آیا
نیازِ عشق پہ سو ناز تھے مجھے، لیکن
غرورِ حُسن سے میں شرمسار ہو آیا
نگاہِ حُسن کا حسنِ طلب، معاذ اللہ
اِشارہ پاتے ہی بے اختیار ہو آیا

تاثرات میں اپنے بہت ہی نازک ہے
وہ حادثہ کہ میں جس سے دوچار ہو آیا
جو ناگوارِ تصوّر ہو کیا کسی سے کہوں
جسے میں خود نہ سُنوں وہ پُکار ہو آیا
طبیعت اپنی ہی جانب سے کچھ مکدّر ہے
میں اپنے دل کے لئے خود غُبار ہو آیا
نہ زندگی کو قبول، اور نہ موت کو منظور
عجیب واقعۂ ناگوار ہو آیا
گراں ہوں دوشِ دوعالم پہ میں سُبک ہو کر
جو اُٹھ سکے نہ کسی سے وہ بار ہو آیا
خدا ہی جانے، وہ کیا وقت تھا کہ میں جس وقت
الم رسیدۂ لیل و نہار ہو آیا
رہا ہوں ایک "نگاہِ کرم" سے کیا محروم
رہینِ ہر ستمِ روزگار ہو آیا
ذرا قرار سے دم بھر ابھی نہ گذری تھی
کہ عمر بھر کے لئے بے قرار ہو آیا
نگاہِ ناز کی بے اِلتفاتیوں کی قسم
سرور بن کے گیا تھا، خُمار ہو آیا
وہاں سے آنے کے بعد اب یہ حال ہے جیسے
میں اپنی موت پہ خود سوگوار ہو آیا

خزاں کے بعد نہ آتی ہو جس چمن میں بہار
میں اُس چمن کا مآلِ بہار ہو آیا

جنونِ عشق نے بسمل کیا ذلیل مگر
فریبِ حُسن سے میں ہوشیار ہو آیا!

آہ بسملؔ جب بدن میں رُوح گھبرانے لگے
اور قضا کم بخت کو آتے بھی موت آنے لگے

عِشق کے جذبات سے بے کیف ہو ایسے میں دِل
حسن کی جانب سے جب پیغامِ شوق آنے لگے

باہمہ ذوقِ محبّت ، باہمہ شوقِ وفا
دل رہ و رسمِ محبّت سے بھی گھبرانے لگے

دوست کی جانب سے کر کے اعتمادِ دوستی
ہائے وہ حالت کہ جب دشمن ترس کھانے لگے

تلخیٔ نامہربانی ہائے دنیا ، آہ جب
دِل کسی کی مہربانی سے بھی گھبرانے لگے

دَم بدم لحظہ بہ لحظہ وہ فراوانیٔ غم
جب کوئی ساعت گزر جائے تو یاد آنے لگے

آہ ، موجودہ مصیبت کی بھیانک شکل میں
آنے والی بھی مصیبت جب نظر آنے لگے

ہائے مجبوری میں وہ خودداریوں کی بے کسی
ناکسوں کے جب زمانہ ناز اُٹھوانے لگے

ہو زمانہ ٹھوکروں کا جِس کی ٹھکرایا ہوا
پھر زمانہ ٹھوکروں سے اس کو ٹھکرانے لگے

ناموافق جب ہو یوں آب و ہوائے زندگی
الحذر ، آب و ہوائے مرگ راس آنے لگے

آہ ، بسملؔ زندگیٔ غم کی وہ نوبت کہ جب
جامۂ ہستی سے بدبُو موت کی آنے لگے

جب رنگ طبیعت کا بدلتی ہے جوانی — اِنسان کی رَگ رَگ میں مچلتی ہے جوانی
جس راہ گزر سے کبھی نکلتی ہے جوانی — ہر نقشِ کفِ پا سے اُبلتی ہے جوانی
اپنا ہی مزاج اپنے ہی بس میں نہیں رہتا — اس طرح طبیعت کو بدلتی ہے جوانی
جذبات کا اللہ رے طبیعت میں تلاطُم — ہر سانس کے ہمراہ اُبلتی ہے جوانی
ہے عقل ہی دل سوز علیٰ رَغمِ محبّت — اور عقل ہی کم بخت سے جلتی ہے جوانی
مِل جائے اگر اس کو محبّت کا سہارا — بے جان لئے پھر کہیں ٹلتی ہے جوانی
ہر گام دلِ عرش دَہلتا ہے دَھمک سے — جب فرشِ نزاکت پہ کبھی چلتی ہے جوانی
حلقوں سے مشائخ کے نکل آتی ہیں آنکھیں — جب سامنے سے ہو کے نکلتی ہے جوانی
جس طرح کہ پھٹتا ہے پہاڑ آگ کا کوئی — ایک ایک بُنِ مُو سے اُبلتی ہے جوانی

با ایں ہمہ اک وقت وہ آتا ہے کہ سنبھل
دِن بھی نہیں ڈھلتا ہے کہ ڈھلتی ہے جوانی

دیارِ جام نے، شہرِ سُبو نے لُوٹ لیا
بہشتِ رنگ نے، فردوسِ بُو نے لُوٹ لیا

نہ مشتری کی خبر ہے نہ کچھ بہا معلوم
ہوا یہ ہے کہ کسی ماہ رُو نے لوٹ لیا

مرے بیان مرے نُطق کی یہ بات نہیں
زبانِ میر میں کہہ دوں کسو نے لوٹ لیا

اَدا اَدا متکلّم نظر نظر مفہوم
بغیرِ لفظ و بیاں گفتگو نے لوٹ لیا

مِری نِگاہ سے بچ کر مجھے وہ دیکھ سکے
نگاہِ ناز کی اِس جستجو نے لوٹ لیا

یہ شرم و شوق کا عالم نہ دیکھتا ہو کوئی
توجّسِ نگہِ چار سُو نے لوٹ لیا

خدا کرے وہ نظر آئے پھر کہیں اور میں
یکایک اُس کو پُکاروں کہ تُو نے لوٹ لیا

ہر آرزو سے کچھ اس طرح ہو گیا بیزار
کہ جیسے دِل کو کسی آرزو نے لوٹ لیا

کیا تباہ تو دہلی نے بھی بہت بسمؔل
مگر خدا کی قسم لکھنؤ نے لوٹ لیا

افسردگیٔ شوق میں دل گدگدائے کون — تیرے غمِ فراق کو دل سے بھلائے کون

جس میں غرورِ حُسن کو ہو اعترافِ عجز — اِس طرح میرے نازِ محبت اُٹھائے کون

جس طرح کھُل گئے ہوں دریچے بہشت کے — آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے یوں مُسکرائے کون

دھومیں مچا کے عشوہ و انداز و ناز سے — میرے شبابِ شوق کی راتیں جگائے کون

تیری ہی برقِ حُسن سے جو تھی فروغ گیر — اُس شمعِ آرزو کو بھلا اب جلائے کون

نظارۂ جمال کی گنجائشیں کہاں — جب تو سما چُکا تو نظر میں سمائے کون

جب تک نہ جائے یاد تری چشمِ شوخ کی — آغوشِ شوق میں مرے شرما کر آئے کون

دل سے ترے خیال نے سب کچھ بھُلا دیا — لیکن ترے خیال کو دل سے بھُلائے کون

اب تک تو ہے یہ حال، مگر کیا خبر کہ اب — افسردگیٔ شوق کو پھر گدگدائے کون

کر لے کوئی نیازِ وفا کو قبولِ ناز — یہ سوچ کر کہ پائے ہوئے کو گنوائے کون

بے اختیار پہلے بھی کھویا تھا دل کو جب — پھر دل پر اختیار خدا جانے پائے کون

اسباب کی خدائی میں آثار ہی تو ہیں — آثار کے خلاف نتائج پہ جائے کون

گرتے ہیں اشک یوں کہ برستے ہوں جیسے پھُول — کیا جانے آنسوؤں میں مرے مُسکرائے کون

لے کام تیغِ ناز سے پھر، ورنہ کیا خبر
قاتل بنے خود، اور مجھے بسمل بنائے کون

اب میں ہوں اور وہ سحر و شام زندگی — سمجھے کوئی کہ ہے کوئی ناکام زندگی

پیتا رہا ہوں بادۂ سرجوش عمر بھر — اب پی رہا ہوں دُردِ تہ جام زندگی

آغازِ زندگی کے وہ انداز دیکھ کر — میں نے سمجھ لیا تھا یہ انجام زندگی

جو مژدۂ حیات دیا تھا شباب نے — تھا موت کا پیام وہ پیغام زندگی

ہوگی وہ رات موت جو گزرے گی قبر میں — یہ موت کیا ہے صرف سرِ شام زندگی

اے وائے زندگی کہ بایں مرگِ ہر نفس — ایک اک نفس ہے موردِ الزام زندگی

وہ تو نہ مل گئی کہیں میرے وجود کو — ہوتی ہے ایک موت بھی ہمنامِ زندگی

برگشتگیِ بخت بھی منہ دیکھنے لگی — کیا پوچھتے ہو گردشِ ایام زندگی

جس میں نہ فکرِ شام تھی جس میں نہ فکرِ صبح — وہ صبحِ زندگی ہے نہ وہ شام زندگی

لے چل قفس میں قبر کے صیادِ مرگ اب — کب سے تڑپ رہا ہوں تہِ دام زندگی

ہے یوں اُمیدِ مرگ میں آسودگیِ ذہن — جیسے نصیبِ موت ہو آرام زندگی

ہے شاہراہِ عشق تو وہ موت اصل میں — جو موت ہو نہ رہ گزرِ عام زندگی

پھر کیوں ہر اک نفس ہے دمِ آخرِ حیات — جب منحصر ہے موت پہ اتمام زندگی

کیا رہ سکیں گے مر کے بھی ہم شاد خلد میں — جب تک رہیں گے ذہن میں آلام زندگی

بسمل قریبِ شام ہے ڈھلنے لگا ہے دن

ہے آفتابِ زیست لبِ بام زندگی

دنیا ہوئی ہے اے دلِ ناکام اجنبی ہر صبح اجنبی ہے، ہر اک شام اجنبی

کیا ہو گیا ہے یہ کہ خود اپنے ہی گھر میں آج محسوس ہو رہے ہیں در و بام اجنبی

کھلتا نہیں ہے عالمِ بیگانگی کا راز لمحے خوشی کے، رنج کا ہنگام اجنبی

باتوں میں دل لگے نہ کسی کام میں لگے ہر بات اجنبی ہے، ہر اک کام اجنبی

جس راہِ زندگی پہ چلا ہوں تمام عمر محسوس ہو رہی ہے بہ ہر گام اجنبی

یا رب لباسِ رندی و مستی ہے یا کفن مانندِ وضعِ جامۂ احرام اجنبی

کیا میکدے میں ہاتھ کسی سمت بڑھ سکے ہر شیشہ اجنبی ہے، ہر اک جام اجنبی

جیسے یہ میکدہ ہو کوئی اور میکدہ ساقی ہے اجنبی، مئے گلفام اجنبی

جن میں بسے ہوئے تھے اُن آنکھوں کے واسطے ہیں مغبچوں کے ردئے دلآرام اجنبی

اپنا ہی عکس جام میں آتا ہے اب نظر پرتو کسی کا جیسے سرِ جام اجنبی

شمعِ سحر ہو بزم میں بیگانہ جس طرح ہے اس طرح چراغ سرِ شام اجنبی

اِس زندگی سے جن کا تعلق نہیں کوئی آنے لگے ہیں دل میں کچھ اوہام اجنبی

آتے ہوں جیسے موت کی جانب سے میرے نام انفاس کے ذریعے سے پیغام اجنبی

بسمل کے نام سے جو پکارے کوئی مجھے
سُنتا ہوں جیسے ہو یہ کوئی نام اجنبی

میرے گھر کے در و دیوار ابھی باقی ہیں
غمزدہ دل کے یہ غمخوار ابھی باقی ہیں

کچھ تو مقتل سے گئے اُٹھ کے جنازوں کی طرح
کچھ تہِ خنجرِ خوں خوار ابھی باقی ہیں

مر گئے نادر و چنگیز تو کچھ بات نہیں
خیر سے آپ تو سرکار ابھی باقی ہیں

زلفِ پُر خم کی قسم، اِس قدِ بالا کی قسم
مستحقِ رسن و دار ابھی باقی ہیں

شرمسار آپ نہ ہوں اپنی مسیحائی پر
لبِ جاں بخش کے بیمار ابھی باقی ہیں

آپ چلنے دیں ابھی بادہ بہ جامِ سقراط
تشنہ لب اور بھی میخوار ابھی باقی ہیں

آپ تنگ آ کے ابھی ہاتھ سے خنجر نہ رکھیں
اور کچھ جان سے بیزار ابھی باقی ہیں

آپ کچھ ابھی اور نمک پاش رہیں
دل فگار و جگر افگار ابھی باقی ہیں

کچھ، گئے حسن کے بازار سے سودا کر کے — کچھ، شہادت کے خریدار ابھی باقی ہیں

بختِ بیدار کئی سو بھی گئے موت کی نیند — اور کچھ طالعِ بیدار ابھی باقی ہیں

ماتمی رسم ابھی بزمِ طرب سے نہ اُٹھے — مرنے والوں کے عزادار ابھی باقی ہیں

اپنے دوزخ کو ابھی سرد نہ فرمائیں حضور — واجب النار، گنہ گار ابھی باقی ہیں

کتنے ہموار کئے اپنے شہیدوں کے مزار — پھر بھی کچھ آپ کے شہ کار ابھی باقی ہیں

خودکشی کر نہ سکیں ہم، تو ہمیں ہیں مجبور — آپ تو جان کے مختار ابھی باقی ہیں

دل کو ڈھا کر مرے تیشہ نہ رکھیں ہاتھ سے آپ — اس عمارت کے کچھ آثار ابھی باقی ہیں

اطلاعاً یہ گزارش ہے بقولِ بسمل
دشنہ و خنجرِ اشعار ابھی باقی ہیں

نہ اب وہ عشق نہ وہ عشق کی ادائیں رہیں
نہ اب وہ حسن، نہ وہ حسن کی ہوائیں رہیں

نہ عشق، عشق رہا اب، نہ حسن، حسن رہا
نہ وہ وفائیں رہیں اب، نہ وہ جفائیں رہیں

وہ حسن و عشق کے راز و نیاز ہی نہ رہے
نہ وہ خطائیں رہیں اب، نہ وہ سزائیں رہیں

مزاجِ حسن و محبّت میں سادگی نہ فریب
نہ وہ یقین رہا اب، نہ وہ دعائیں رہیں

غرورِ حسن کی بے التفاتیوں کی طرح
نگاہِ شوق رہی اب نہ التجائیں رہیں

نہ وہ عیادت و تسکیں، نہ وہ دلِ رنجور
نہ اب وہ دردِ محبّت، نہ وہ دوائیں رہیں

نہ زندگی سے وہ نفرت، نہ موت کی حسرت
وہ بد دعائیں رہیں اب، نہ وہ دعائیں رہیں

ربابِ عشق، نہ مضرابِ حسن، کچھ بھی نہیں
وہ نغمہ ہائے تمنّا، نہ وہ صدائیں رہیں

نہ میکدہ، نہ وہ میخوار، اور نہ وہ ساقی
نہ وہ چمن، نہ بہاریں، نہ وہ گھٹائیں رہیں

بدل گئے سحر و شامِ زندگی بسمل
وہ زندگی کے مناظر، نہ وہ فضائیں رہیں
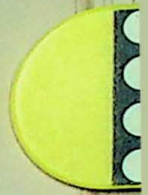
حورِ حرم

شریکِ راحت و غم اے مری شریکِ حیات
مری حیات کے مقصد کی جان ہے تری ذات

بہار ہے یہ جہاں نازشِ بہار ہے تُو
کہ حُسنِ صنعتِ خالق کی شاہکار ہے تُو

یہ حُسنِ سادہ یہ معصوم ادائیاں تیری
نہاں ہیں تجھ سے بھی خود دل ربائیاں تیری

مذاقِ عشق کو تقدیس ہے تری تسلیم
اَدا اَدا تری کوثر نگہ نگہ تسنیم

ہمیشہ فرض اَدائے نیاز ہے تجھ پر
اگرچہ حُسن و محبّت کو ناز ہے تجھ پر

سما گئی ہے کچھ اِس طرح میری ہستی میں
کہ اپنے آپ کو رکھّا نہ اپنی ہستی میں

بغیر میرے تجھے تُو بھی خود عزیز نہیں
کہ جیسے میرے بغیر آپ کوئی چیز نہیں

مری نگاہ سے وابستہ ہے نگاہ تری
مجھی سے واہ تری اور مجھی سے آہ تری

مُجھی سے تجھ کو محبّت مجھی سے شکوہ ہے
مُجھی سے دین ہے تیرا مُجھی سے دُنیا ہے

ہمیشہ میری ہی چتون کو دیکھتے رہنا
مری نظر کی اجازت کے بعد کچھ کہنا

مرے ہی واسطے خود بین و خود نما ہونا
مجھی کو صرف میسّر ہے آئینہ ہونا

لحاظ دل شکنی دل دہی کا رکھتی ہے
خیال میری خوشی ناخوشی کا رکھتی ہے

اگرچہ پاسِ خوشی بھی نہیں ہے کم تجھ کو — مگر خوشی سے سِوا ہے لحاظِ غم تجھ کو

تُو ناخوشی میں بھی رہتی ہے میری خاطر خوش — ہزار غم بھی ہوں دل پر مگر بہ ظاہر خوش

شریکِ دِل سے مِری حالتِ تباہ میں ہے — نِگاہ میں ہے تبسّم، ترنّم آہ میں ہے

جو کوئی بات گراں بھی تجھے گُزرتی ہے — تو کس خوشی سے طبیعت پہ جبر کرتی ہے

تڑپ کے سینے سے کیوں دل نکل نہیں آتا — کہ دَم پہ بن کے بھی تیوری پہ بَل نہیں آتا

یہ تیری محنتِ پیہم یہ تیری صبح و شام — مرا خیال ہے، بچّوں کی فکر گھر کا کام

ترے نصیب کے دن ہیں کچھ ایسے دُنیا میں — خوشی نہ ہو تری قسمت کی جیسے دُنیا میں

یہ سرد آہ تری جس سے تُو سُلگتی ہے — اِس آہ کی دِل قدرت پہ چوٹ لگتی ہے

صد آفریں تجھے یہ تیری فطرتِ عالی — زہے یہ ظرف زہے تیری ہمّتِ عالی

تُو بے نیاز ہے ہر چند بے نیاز نہیں — ترا نیاز کسی کا بھی رہنِ ناز نہیں

یہ کر رہی ہیں اگرچہ ڈگر ڈگر آنکھیں — کسی کے سامنے جُھکتی نہیں مگر آنکھیں

خیال بھی تو کسی کا نہیں ترے دل میں — نہیں ہے تیرے سوا جیسے کوئی محفل میں

اگرچہ سِلکِ گہر بھی ہو کوئی نخوت خُو — مجال کیا کہ اُسے آنکھ اُٹھا کے دیکھے تُو

مقابلہ نہیں کرتی تُو اپنی حالت سے — غرض نہیں تجھے اہلِ جہاں کی ثروت سے

ہزار غم سے تنفّس ہے سرد و نرم رَواں — تری رگوں میں ہے غیرت کا خونِ گرم رواں

یہ کہہ رہا ہے ترا اشکِ دیدۂ غم ناک — کہ تاجِ شاہی کے موتی کی آبرو پر خاک

ہلائے دیتے ہیں تاروں کو آسمانوں کے — یہ چار پیسے کے آویزے تیرے کانوں کے

مئے نشاط ترے ساغرِ سفال میں ہے — خوش اپنے حال میں ناخوش بھی اپنے حال میں ہے

کرے نہ کیوں تری ہستی پہ حسنِ فطرت ناز — کہ بے نیازِ تکلّف ہے تیرا ہر انداز

یہ سادگی کو ترے حُسن کی ہے اندازہ — کہ حُسن کا ہے فقط سادگی ہی اک غازہ

مٹے نہ فطرتِ بے لوث کے تری جوہر　　اثر نہیں کوئی تیرے ضمیر و باطن پر

تو اور قدیم روایات اور وفاداری　　جدید علم نہ تہذیبِ نو کی عیاری

جہاں میں جس سے ہے رنگیں مزاجیٔ نسواں　　وہ لاکھ علم ترے جہلِ سادہ پر قرباں

ہزار جہل سے بدتر ہے چاک دامانی　　ہزار علم سے بہتر ہے پاک دامانی

بنائیں جن کو سلیقہ شعاریاں پُرفن　　مُبارک اُن کے سلیقوں سے تیرا الھڑپن

اُٹھے حجابِ فریب اب جو دیدۂ دل سے　　حقیقتوں کا ہوا انکشاف باطل سے

خجل بھی خوش بھی ہوں تجھ سے یہ بات کہہ کر میں　　سمجھ سکا ہوں تجھے تجھ سے دُور رہ کر میں

خرابیوں کو بھی میری نباہنے والی　　بُرائیوں کو بھی میری سراہنے والی

مرے چلن مجھے پہنچائیں جس مُصیبت پر　　اُسے بھی کرتی ہے محمول اپنی قسمت پر

گزر گئے ہیں مگر دل پہ داغ ہیں اب تک　　وہ دن جو لعنتِ قلب و دماغ ہیں اب تک

کہاں ہے میری ہوس کاریوں کا وہ عالم　　نظر ہوئی جو ترے حُسنِ سادہ سے برہم

پھرا نظر میں طلسمِ خیالِ رنگا رنگ　　ہوا اسیرِ فریبِ جمالِ رنگا رنگ

فتورِ عقل کو میں جب شعور سمجھا تھا　　ہر ایک لعبتِ لعنت کو حور سمجھا تھا

تری وفاؤں کے سجدوں سے ہو کے میں بیزار　　ہوس کی ٹھوکریں کھاتا پھرا سرِ بازار

نہ آئی لینے تری یاد بھی جہاں مجھ کو　　دلِ خراب نے پہنچا دیا کہاں مجھ کو

دلِ خراب تھا عصیاں گہِ جوانی تھی　　مرا شباب تھا، قُرباں گہِ جوانی تھی

مگر ہنوز ترا حاصلِ دُعا میں تھا　　خدا کے سامنے سجدوں کا مدعا میں تھا

دُعائیں تُو بہ درِ لاشریک مانگتی تھی　　خُدا سے میری محبت کی بھیک مانگتی تھی

اُن آنسوؤں کی دُعاؤں کا تیری ہے یہ اثر　　وُہی ہوں میں، وہی تو ہے، وُہی ہمارا گھر

اگرچہ آئینۂ خُوب و زشت ہے دُنیا　　مگر ہمارے لئے اب بہشت ہے دُنیا

ملالِ رشک نہ اندیشۂ جدائی ہے　　ہم اب وہاں ہیں جہاں عشق کی خدائی ہے

مصیبتوں میں ہے راحت ہماری جنّت میں　　ہر ایک غم ہے مسرت ہماری جنّت میں

اُجاڑنے سے یہ جنّت کہیں اُجڑتی ہے

مصیبتوں سے محبّت میں جان پڑتی ہے

خیر مقدم

ٹونک، وہ مستِ شباب آنے کو ہے
جیسے ساغر میں شراب آنے کو ہے

شبنمِ اشکِ جدائی! مژدہ باد
وہ شعاعِ آفتاب آنے کو ہے

ہو رہی ہے دل میں طالع صبحِ خلد
وہ برافگندہ نقاب آنے کو ہے

ہے تموج سا فضائے شہر پر
حسن پر جیسے شباب آنے کو ہے

چشمِ نظّارہ طلب کے سامنے
جلوۂ برق انتساب آنے کو ہے

اب دلِ پُرشوق پر چھائے گا حسن
صحنِ گلشن پر سحاب آنے کو ہے

دیکھ اے آوارگیٔ چشمِ شوق
اب وہ باچشمِ عتاب آنے کو ہے

گریۂ بے اختیارِ شوق، دیکھ
خود وہ باچشمِ پُرآب آنے کو ہے

وجہِ تسکینِ دلِ پُر اضطراب
با دلِ پُر اضطراب آنے کو ہے

خواب بن بن کر جو آئی آج تک
بن کے اب تعبیرِ خواب آنے کو ہے

میرے حزن و غم سے جو لوگوں کو تھے
اُن سوالوں کا جواب آنے کو ہے

لے مبارک اے دلِ محبوسِ غم!
اب نویدِ فتح باب آنے کو ہے

آرہی ہے انتخابِ کائنات — کائناتِ انتخاب آنے کو ہے

کس کا حُسن اُس کا سا ہے اُس کے سوا — خود سوال و خود جواب آنے کو ہے

اُس کا حسن اور میرا آغوشِ نظر — خُم سے شیشے میں شراب آنے کو ہے

جو ہوئی آمین کہہ کر خود قبول — وہ دعائے مستجاب آنے کو ہے

شاہکارِ فکر و فکرِ شاہکار — میری نظمِ کامیاب آنے کو ہے

باہزاراں آیۂ انداز و ناز — مُصحفِ حُسن و شباب آنے کو ہے

"شاعری جزویست از پیغمبری" — حُسن کی مجھ پر کتاب آنے کو ہے

اللہ اللہ دل کا احساسِ نشاط — جام میں جیسے شراب آنے کو ہے

اس کو کہتے ہیں بہار اندر بہار — گل رُخ و گلگوں نقاب آنے کو ہے

سائے پر ہے سایۂ ابرِ بہار — یوں سراپائے حجاب آنے کو ہے

گوشِ محروم صدائے ناز ہیں — نغمۂ عشرت رباب آنے کو ہے

میری راتیں ہوں گی اور اب میرے دن — ماہتاب و آفتاب آنے کو ہے

اُس کے کلمہ گو ہوں سب اصنامِ حسن
اک خداوندہ خطاب آنے کو ہے

اِنسان

اِک کش مکشِ حال میں انساں ہے ابھی تک
کافر ہے ابھی تک نہ مسلماں ہے ابھی تک

گو دیکھ چکا حُسن کا خورشیدِ ازل تاب
ذرّات کے آئینوں میں حیراں ہے ابھی تک

گو بزمِ تصور میں ہے اِک مشعلِ ایماں
بے شمعِ یقیں دل کا شبستاں ہے ابھی تک

اک قصر ہے خود حکمتِ معمارِ ازل کا
دیوانۂ بام و درِ ایواں ہے ابھی تک

اس کے لئے مہکی ہیں بہشتوں کی بہاریں
یہ خوگرِ بوئے گل وریحاں ہے ابھی تک

ہونا تھا گُلِ سرسبدِ بزمِ حقائق
افسانۂ اوہام کا عنواں ہے ابھی تک

بیٹھا ہوا کب سے ہے سرِ کوثرِ آیات
افسوس کہ لب تشنۂ عرفاں ہے ابھی تک

حالانکہ خود اِک حُسنِ ازل کی ہے تجلّی
ظلمات میں یہ چشمۂ حیواں ہے ابھی تک

اقوال کی دُنیا میں ہے فردوس کا طالب
اعمال کی دنیا سے گریزاں ہے ابھی تک

عصیاں کے خلاف اُترے ہیں انساں پہ صحیفے
انساں ہے کہ آلودۂ عصیاں ہے ابھی تک

اس قامتِ موزوں کا خمِ رُوح کبھی دیکھ
یہ احسنِ تقویم میں حیواں ہے ابھی تک

آباد ہے اس نام سے ہر ذرّہ زمیں کا
دُنیا مگر انسان سے ویراں ہے ابھی تک

مفہومِ ازل اس سے ہے خود گردشِ دوراں
کم بخت یہ سرگشتۂ دوراں ہے ابھی تک

فاش اس کی نگاہوں پہ خدائی کے ہیں اَسرار خود اپنی نگاہوں سے یہ پنہاں ہے ابھی تک

ہر چپہ زمیں اس کا وطن ہے مگر اس کو ہر صبحِ وطن شامِ غریباں ہے ابھی تک

جن خطروں سے انساں کو ڈرایا ہے خدا نے اُن سب سے خطرناک خود انساں ہے ابھی تک

انسان کے ملبوس ہیں تہذیب و تمدّن
انسانیت افسوس کہ عریاں ہے ابھی تک

ماتمِ انسانیت

جو ابھی پیشِ نظر تھا وہ سماں کیا ہوگیا
وہ زمیں کیا ہوگئی وہ آسماں کیا ہوگیا

شمع سے کیفیتِ سوزِ دروں کیا ہوگئی
بزم سے پروانۂ آتش بجاں کیا ہوگیا

اَب نہ پھولوں میں وفا کی بُو نہ رنگ اخلاص کا
تجھ کو اے آب و ہوائے گلستاں کیا ہوگیا

خوفِ گلچیں تھا نہ جس میں ہیبتِ صیّاد تھی
وہ چمن کیا ہوگیا وہ آشیاں کیا ہوگیا

جس کی تمکینِ نظر سے کانپتے تھے انقلاب
بزم کا وہ ضامنِ امن و اماں کیا ہوگیا

زندگی سے جس کی ٹکرا کر اُچٹ جاتی تھی موت
آدمی وہ رُوح کا سنگِ گراں کیا ہوگیا

نذر کرتا تھا جسے پیکِ اجل ذوقِ بقا
زندگی کا وہ مذاقِ جاوداں کیا ہوگیا

صُبح کا تھا خوف جس کو اور نہ فکرِ شام تھی
آج وہ مستغنیٔ دَورِ جہاں کیا ہو گیا

جس میں اوروں کا زیان و سُود بھی ملحوظ تھا
دِل سے وہ اندیشۂ سود و زیاں کیا ہو گیا

صِرف اپنا گھر ہو زیرِ سایۂ ابرِ بہار
جذبۂ ہمدردیٔ ہمسائگاں کیا ہو گیا

جس کو ہمدردی نے جب چاہا برابر کر دیا
دردو درماں کا وہ فرقِ درمیاں کیا ہو گیا

صُور بھی پھونکیں اِن آوازوں میں تو ناکام ہو
معبدوں کا جذبِ ناقوس و اذاں کیا ہو گیا

ہو رہی ہے اس کے ایمانوں سے اَب تعمیرِ دیر
یا الٰہی اِس حرم کا پاسباں کیا ہو گیا

اَب نہ وہ رِند اور نہ وہ مستی، نہ وہ اَبرِ بہار
تیرے میخانے کو اے پیرِ مغاں کیا ہو گیا

پوچھتے تھے کل تک اپنی منزل اہلِ کارواں
آج منزل پوچھتی ہے کارواں کیا ہو گیا

نعرۂ جمہوریت

آج ہم آزاد ہیں ہندوستاں آزاد ہے
یہ زمیں آزاد ہے یہ آسماں آزاد ہے

اوجِ آزادی پہ ہے جمہوریت کا آفتاب
آج جو ذرہ جہاں بھی ہے وہاں آزاد ہے

مِٹ چکا ہے آج سے فرقِ بلند و پستِ مُلک
ہند از تحت الثریٰ تا لامکاں آزاد ہے

اِمتیازِ لالہ و گل ہے، نہ فرقِ خار و خس
سایۂ ابرِ بہارِ گلستاں آزاد ہے

ذرّے ذرّے کو ملی ہے وسعتِ برِّ عظیم
قطرہ قطرہ مثلِ بحرِ بے کراں آزاد ہے

اَب ہوائے شرق سے گونجے فضائے غرب تک
نعرۂ جمہوریِ ہندوستاں آزاد ہے

جتنی ہم چاہیں پئیں اور جتنی وہ چاہے پلائے
میکدہ آزاد ہے پیرِ مغاں آزاد ہے

نفع ہے تو باہمی، نقصان ہے تو باہمی
مُلک از اندیشۂ سود و زیاں آزاد ہے

گُردوارے پر کلیسا پر، حرم پر، دیر پر
چاہے جس منزل پہ ٹھہرے کارواں آزاد ہے

کل قفس تھا جس قدر وابستۂ آلامِ زیست
آج اس سے بھی زیادہ آشیاں آزاد ہے

مدتوں کم بخت اسیرِ باغِ ہندستاں رہی
اب جہاں چاہے چلی جائے خزاں آزاد ہے

اللہ اللہ بسمل آزادی کی فرمے داریاں
آدمی کم بخت دنیا میں کہاں آزاد ہے

حیاتِ نو

نیا سماں ہے، نیا اک جہاں ہے اور ہم ہیں — نئی زمین، نیا آسماں ہے اور ہم ہیں

نئے مقام، نئے مرحلے، نئی راہیں — نئے ارادے، نیا کارواں ہے اور ہم ہیں

ہمارے نقشِ قدم ہیں یہ مہر و ماہ و نجوم — ہماری راہ سرِ کہکشاں ہے اور ہم ہیں

ہمارا خون جواں، دل جواں، دماغ جواں — جوان ہمت و عزمِ جواں ہے اور ہم ہیں

وہ جس حیات پہ تھی مرگِ ناگہاں طاری — وہی حیات ہے اور جاوداں ہے اور ہم ہیں

گئی وہ قصّۂ عہدِ کہن کی بات گئی — نیا زمانہ، نئی داستاں ہے اور ہم ہیں

ہم اپنے سود و زیاں کے ہیں آپ ذمّہ دار — ہمارا سود، ہمارا زیاں ہے اور ہم ہیں

وہی قفس جو کبھی آشیاں ہمارا تھا — وہی قفس ہے کہ اب آشیاں ہے اور ہم ہیں

ہوئے ہیں دیر و حرم سے ہمارے کچھ پیماں — ہمارے اُن کے خدا درمیاں ہے اور ہم ہیں

ہر ایک رنگ کے پھول اس میں ہیں شریکِ بہار — ہمارا مشترک اک گلستاں ہے اور ہم ہیں

ہمیں بھی ذہن و فکر اپنے بدلنے ہیں بسملؔ
نئے خیال کا ہندوستاں ہے اور ہم ہیں

گاندھی جی کی موت پر

مُردہ دلوں کے نام ہے فرمانِ زندگی
تیری صدائے مرگ ہے اعلانِ زندگی

درسِ حیات دے گئی تیری اجل ہمیں
پہنچا ہے تیری موت سے فیضانِ زندگی

تیری مجاہدانہ اجل نے دیا یہ درس
ڈرتے نہیں ہیں موت سے مردانِ زندگی

فردوس در کنار ہے ہر خارِ راہِ مرگ
دشتِ اجل ہے رشکِ گلستانِ زندگی

تاریکیاں حیات کی روشن اسی سے ہیں
شوقِ اجل ہے شمعِ شبستانِ زندگی

پیغامِ موت کا ہے پیامِ حیاتِ نو
شامِ اجل ہے صبحِ درخشانِ زندگی

"ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق"
یہ موت اصل میں ہے نگہبانِ زندگی

پنجے سے موت کے نہ ترا ہاتھ مُڑ سکا
چھوٹا نہ تیرے ہاتھ سے دامانِ زندگی

قربان زندگی، تری اس شانِ موت پر
ایسی ہی موت تھی ترے شایانِ زندگی

تیری طرح مریں گے نہ جو ملک و قوم پر
اُٹھیں گے روزِ حشر پشیمانِ زندگی

مولانا ابوالکلام آزادؒ

کم ہوا کرتے ہیں اس دُنیا میں وہ مردانِ کار
زندگی اور موت دونوں کو ہو جن پر افتخار

زندگی اپنے محاسن خود بیاں کرتی نہیں
موت کرتی ہے محاسن زندگی کے آشکار

زندگی رکھتی ہے آغوشِ بقا میں کچھ نفس
موت کرتی ہے حیاتِ جاوداں سے ہم کنار

جب سماتی ہے یہ بڑھ کر وسعتوں میں موت کی
آبِ جوئے زندگی بنتی ہے بحرِ بے کنار

ثبت ہو جاتا ہے لوحِ دہر پر اُس کا دوام
موت کر دیتی ہے جس کی زندگی کو اُستوار

بالعموم انساں کو موت آتی ہے حسبِ زندگی
ہے یہی کچھ فطرتِ عادل کا دستورِ شعار

الفراق اے منزلت یابندۂ مرگ و حیات
موت کے راس البضاعت، زندگی کے شاہکار!

تیری مرگ و زیست دو حلقے ہیں اک زنجیر کے
سلسلہ کردار کا تیرے ہے مثلِ کوہسار

تھا اسی کا مقتضی تیرا عمل آغاز سے
زندگی جس موت پر منتج ہوئی پایانِ کار

سِلسلہ جن کی فضیلت کا ہے تا آخر القرون — چند اُن اسلاف کا تھا آخری تُو یادگار

موج اندر موج تھا اک قُلزُمِ ذخّارِ فہم — عِلم کا تُو ایک عالم تھا دیار اندر دیار

تھا ترے فتراک میں ماضی تو اِک صیدِ زبوں — تھی تری فکرِ قدر انداز مستقبل شکار

ما کدر تھا رَد ترا اور ما صفا تیرا قبول — نہی و امرِ دیں برحق تیرا ترک و اختیار

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق — تُو مشیرِ عقل تھا اور تُو جُنوں کا مُستشار

تیرے ہی نقشِ قدم پر پڑتے ہیں سب کے قدم — کس قدر روندی ہے تُو نے عظمتوں کی رہگزار

تھا ترے آغازِ عظمت ہی کا پرچم الہلال — تھی تری صُبحِ نخستیں رَوکشِ نصف النہار

کس قدر ویران ہے مستقبلِ انسانیت — عالمِ تخلیق میں ہے اِک خلائے بے کنار

ہو سکے گی کیا تلافی اب غمِ مافات کی — چشمِ ہستی حشر تک شاید رہے گی اشکبار

تھی تری وضعِ تواضع میں سرافرازی کی شان — تیری اُفتادِ طبیعت میں ہمالہ کا وقار

ناطقہ تیری طلاقت پر اگر قُربان تھا — تھی طلاقت تیرے اندازِ خطابت پر نثار

اس طرح مُنہ سے ترے جھڑتے تھے پھول الفاظ کے — خُلد سے جیسے بہاروں کا گرے اِک آبشار

جنبشِ ادنےٰ تھی تیرے کلک کی اعلیٰ ادب — غازۂ روئے نگارش تیری خاطر کا غُبار

نامۂ اعمال در دست آئیں گے جس وقت لوگ — حشر میں تُو آئے گا تفسیرِ قرآں در کنار

ناموافق جس قدر ہوتی سیاست کی فضا — ہمّتِ عالی کو ہوتی اتنی ہی کچھ سازگار

قلعۂ احمد نگر کو یاد ہیں وہ صُبح و شام — تھی جہاں شامِ خزاں تیرے لئے صُبحِ بہار

ہاں پریشاں کُن تری جمعیّتِ خاطر کو تھا — مُسلمِ ہندوستاں کا افتراق و انتشار

منتہائے عزم تیرا اِس سے ظاہر ہے کہ تھی — ہم رہوں کی منزلِ مقصود تیری رہگزار

تھا جہانتابِ فضیلت تیرا خورشیدِ حیات — اب حیات افروزِ عظمت ہے تری شمعِ مزار

سَر بہ افلاک اِس زمیں کو کر گئی کس[1] کی نگاہ — زیرِ پائے مسجدِ جامع بنا کر یہ مزار

[1] پنڈت جواہر لال نہرو

مسجدِ جامع! تری عظمت کا ضامن ہو گیا — علم و دیں کا اِک سُتوں، عزم و عمل کا اِک منار

سر بسجدہ ہے وہ تیری سیڑھیوں کے سامنے — تیری محرابوں میں بھی ایسے نہیں طاعت گزُار

اُس کے ذِمّے تھے جو تیرے حق وہ پورے کر گیا — اب ترے ذِمّے ہے اُس پر رحمتِ پروردگار

ثبت ہے عظمت پہ تیری مُہرِ توثیقِ دَوام

یہ عظیم المرتبت تُربت، فلک رفعت مزار

سیلِ غم

پنڈت جواہر لال نہرو کی موت پر

ہوگئی ساری داستاں ہمہ غم / از زمیں تا بہ آسماں ہمہ غم

غم ہی غم صبح، شام غم ہی غم / زندگی ہے تمام غم ہی غم

غم ہی غم ہے تمام عالم میں / غرق، عالم تمام ہے غم میں

مہر غم گیں ہے، ماہ غم گیں ہے / گل سفید و سیاہ غم گیں ہے

غم زدہ غایت و غرض غم گیں / ہے غمیں جوہر و عرض غم گیں

عام اک حسِ مشترک غم ہے / شرق سے لے کے غرب تک غم ہے

پھول غم گیں ہیں باغ غم گیں ہیں / دل ہیں غم گیں، دماغ غم گیں ہیں

قیس و لیلیٰ و ساربان غم گیں / کارواں کا ہے کارواں غم گیں

جس قدر غم ہے کس قدر کم ہے / مرگِ انسانیت کا ماتم ہے

ملک در ملک شہر در شہر، آہ / ہر طرف غم ہی غم خدا کی پناہ

یہ کوئی غم کدہ ہے یا دہلی / کوئی ماتم کدہ ہے یا دہلی

موت کا دوش ہے کہ دھرتی ہے / دوش پر زندگی کی ارتھی ہے

ستم و جورِ آسمانی سے — اُٹھ گئے آج دارِ فانی سے
رہ نمائے جہاں جواہر لال — میرِ ہر کارواں جواہر لال
اے بَدا دورِ چرخِ بد اسلوب — ہو گیا مہرِ نیم روز غروب
دوپہر کو ہوئی ہے آج وہ شام — روک دی جس نے گردشِ ایّام
عہدِ تاریخ جیسے ختم ہوا — رُک گیا یوں قلم مؤرّخ کا
لکھ گیا داستانِ آزادی — رہبرِ کاروانِ آزادی
کر گیا ملک و قوم کو آزاد — خاتمِ دورِ جبر و استبداد
ہو گئی قدر ہر روایت ختم — شرف و مجدِ آدمیت ختم
کس کے مرنے پہ آہ روئیں گے ہم — موت اب کس کی ہو گی قابلِ غم
حاملِ وصفِ بے شمار تھے وہ — کتنے اچھّوں کی یادگار تھے وہ
اہلِ فضل اُن میں کتنے شامل تھے — کس قدر جامعِ فضائل تھے
آج کس کس سے ہم ہوئے محروم — اُن سے زندہ تھے کس قدر مرحوم
شخصیت ہو تو شخصیت ایسی — مرتبت ہو تو مرتبت ایسی
اُن کی محبوبیت میں عظمت تھی — اور عظمت میں اُن کی محبوبی
اُن کا انداز کتنا پیارا تھا — جامہ زیبی نے قول ہارا تھا
اُن کے غصّے میں پیار شامل تھا — شامل اُن کے دماغ میں دل تھا
صاحبِ طرز، مالکِ تحریر — مایۂ ناز وہ ادیبِ شہیر
کتنی مطبوعِ طبع مطبوعات — وجہِ تالیفِ قلب تصنیفات
جن سے محظوظ و مستفید ہوا — روس، انگلینڈ، جرمن، امریکہ
اُن کی عزّت زمانے بھر میں تھی — اور اتنی ہی جتنی گھر میں تھی

متاثر تھا اُن سے سارا جہاں — امنِ عالم کے تھے وہ رُوحِ رواں

جنگ سے جس جگہ گریز ہو ننگ — تھا وہاں ذہن میں تصوّرِ جنگ

اُن کا دورِ وزارتِ عظمیٰ — بابِ زرّیں ہے اِک سیاست کا

تھی زمانے میں بے عدیل و نظیر — اُن کی فہم و فراست و تدبیر

اب کہاں پاسبانِ ملک ایسے — نیّرِ آسمانِ مُلک ایسے

ہاں مگر وہ غروب ہو کر بھی — دے گئے روشنی ہمیں اپنی

سرد ہو کر بھی آفتابِ حیات — کر گیا ہم کو گرمِ عزم و ثبات

اُن کے آدرش ہم نہ بھولیں گے — عمر بھر اُن کا غم نہ بھولیں گے

یاد رکھیں گے زندگی اُن کی — زندگی اب ہے پیروی اُن کی

راہِ پُر پیچ و خم پہ چلنا ہے

اُن کے نقشِ قدم پہ چلنا ہے

جنگ ہے جذبۂ زبوں جنگ ہے رسمِ کُشت و خوں
جنگ درندگی کی خو، خوئے درندگی جنوں

جنگ برائے جنگ کا کوئی جواز ہی نہیں
جنگ فسادِ ذہن و فکر، جنگ فتورِ عقل و دیں

جنگ وہ کچھ سہی مگر جنگ ہو ناگزیر اگر
جنگ ہے عینِ عقل و دیں، جنگ سے جب نہ ہو مفر

جنگ کی شرح و بست میں حُسنِ تضاد بھی تو ہے
جنگ فساد ہے اگر جنگ جہاد بھی تو ہے

قتل کے مسئلے میں اِک نکتۂ خاص بھی تو ہے
قتل حرام ہے اگر قتل قصاص بھی تو ہے

جنگ برائے جنگ اگر ہو تو وہ جنگ قہر ہے
جنگ برائے امن اگر ہو تو وہ جنگ مہر ہے

کون یہاں ہے جنگ جو کون یہاں ہے جنگ خو
پہلے ہی سرد ہے لہو سُن کے وَلاَ تُقَاتِلُوا

کِس کو خیالِ جنگ تھا کِس کو جنونِ جنگ ہے
ہاں مگر اب سکوت بھی موجبِ عار و ننگ ہے

اَب کہ وطن اور آبرو، اب کہ چمن، یہ رنگ و بُو
اَب کہ تمام کاخ و کو، اَب کہ من و شما و تو

خطرۂ بے پناہ میں خطرۂ بے اماں میں ہیں
خطرۂ بے اماں میں ہیں نرغۂ دشمناں میں ہیں

اب کہ عدوئے جابر و جارحِ پُر جفا و جور
ہم سے برت رہا ہے اور حیلہ و مکر و فن کے طور

اَلحذر، الّتوائے جنگ، رجعتِ فوج اَلحفیظ
زیرِ سکوتِ سطحِ بحر شدّتِ موج اَلحفیظ

جذبۂ مہر دل میں اَب آتشِ سنگ کیوں نہ ہو
نغمۂ سازِ امن اب نعرۂ جنگ کیوں نہ ہو

جنگ سے خود ہی کُھل گیا عُقدۂ رازِ جنگ و قتل
وقت سے ہم کو مِل گیا حکمِ جوازِ جنگ و قتل

اب کہ وطن کے واسطے ہم پہ جہاد فرض ہے
جانِ وطن کی ہے، یہ جان ہم پہ وطن کا قرض ہے

موت ہے لازمی تو پھر کوئی شہید کیوں نہ ہو
نوحۂ مرگ کی صدا نغمۂ عید کیوں نہ ہو

ہم کہ ہیں آفتابِ صبح گرم مزاج و نرم خُو
آگ میں سوز جس طرح پھول میں جس طرح کہ بُو

آبِ رواں بھی ہیں ہمیں تیغِ رواں بھی ہیں ہمیں
ابرِ بہار بھی ہمیں برقِ جہاں بھی ہیں ہمیں

قہر بھی مہر بھی ہمیں صُور بھی چنگ بھی ہمیں
موم بھی سنگ بھی ہمیں صُلح بھی جنگ بھی ہمیں

ہم سے کوئی ملے تو ہم، مہر و محبّتِ تمام
ہم سے کوئی لڑے تو ہم زہرِ ہلاکتِ دوام

عدو کے ساتھ وہ بیٹھے ہوئے ہیں میرے پاس
بچی بچی سی نگاہیں رُکے رُکے انفاس

رہینِ کشمکشِ عاشقی و بوالہوسی
تعلّقاتِ قدیم و جدید کا احساس

زہے تراوشِ جذباتِ مختلف یعنی
اُدھر نگاہِ محبّت اِدھر نگاہِ یاس

زہے کرشمہ زہے اعتبارِ عشق و ہوس
نگاہِ حسن بھی ہوتی ہے کیا مزاج شناس

ادا ادا کو ہے احساس ذمّہ داری کا
اُدھر وُثوق رہے اور اِدھر نہ ٹوٹے آس

یہ مشکلات یہ مجبوریاں ارے توبہ
نظر سے اور کچھ اظہار دل میں کچھ احساس

کبھی ترنّمِ گلبانگ اور کبھی دمِ سرد
کبھی شگفتہ شگفتہ کبھی اُداس اُداس

عجیب کشمکش و گومگو کا عالم ہے
کچھ اس کا پاس اُدھر ہے اِدھر ہے میرا پاس

صد اعتراف و صد اظہارِ شوق کی ضامن
کبھی کبھی غلط انداز اِدھر نگاہِ یاس

اداشناس یہی حسن کا ہے کچھ ہر چند
ملی ہے عشق کو شوریدگی بجائے حواس

ہر ایک بات سے افشائے راز ہے لیکن
خدا کا شکر رہی تی نہیں ہوس حسّاس

مزاجِ حُسن خلافِ وفا نہیں بسملؔ
مگر وفائے ہوس جب نہ آئے حسن کو راس

سیاہ ساڑی

مصروفِ سیرِ شام لبِ بام ہے کوئی
یا صبحِ حُسن شام بر اندام ہے کوئی

خود جلوۂ صبیح ہے ساڑی سیاہ ہے
پُتلی ہیں جیسے آنکھ کی نورِ نگاہ ہے

فانوسِ شب میں جیسے ہو شمعِ خیالِ دوست
جیسے شبِ فراق میں یادِ جمالِ دوست

اَبرِ سیاہ رنگ میں بجلی کی سی چمک
فردِ سیاہ کار میں رحمت کی اک جھلک

پرتو گھٹا کا غنچۂ نورس لئے ہوئے
شام اَوَدھ ہے صُبحِ بنارس لئے ہوئے

اِک آفتاب کالی گھٹا کے ہے دوش پر
دیوی ہے شام کی کہ خداوندۂ سحر

قسمت چمک اُٹھی ہے لباسِ سیاہ کی
روشن کسی کی رات ہو جیسے گُناہ کی

رُخ پر اُڑائے جاتی ہے آنچل کو یوں ہَوا
جس طرح چاند پر سے ہو بادل گُزر رہا

او پیکرِ صبیح ! لباسِ سیاہ میں
کافر تجھی سے آئی ہے لذّت گناہ میں

ہے عشقِ سادہ حسن سے مجبورِ معصیت
شاید بنا تجھی سے ہے دستورِ معصیت

پیدا تجھی سے دل میں ہے امکانِ آرزو
نظّارۂ جمال ہے اعلانِ آرزو

او کعبۂ نگاہِ تمنّا سلامِ شوق
پہنچا رہی ہیں تجھ کو نگاہیں پیامِ شوق

جوانی کی کہانی

بیوہ کی زبانی

میں وہ عمرِ محبت ہوں جو فرقت میں گزرتی ہے
وہ افسردہ جوانی ہوں جو حسرت میں گزرتی ہے

جو عشرت میں گزر جائے اس اک دن کی تمنا ہوں
اور اس اک رات کی حسرت جو راحت میں گزرتی ہے

وہ کروٹ ہوں شبابِ مضطرب پیہم جسے بدلے
وہ حالت ہوں جو انگڑائی کی حالت میں گزرتی ہے

جوانی اور پھر میری جوانی اک قیامت ہے
کسی کو کیا خبر جو اِس قیامت میں گزرتی ہے

جوانی کو بچا لوں کیوں کر الزامِ تمنا سے
تمنا خود نگہ بن کر شہادت میں گزرتی ہے

جوانی کے لئے اکثر سنا کرتی تھی بچپن میں
تمناؤں میں کٹتی ہے محبت میں گزرتی ہے

مگر یہ کیا خبر تھی وہ جوانی آئے گی مجھ پر
کہ جو لعنت میں کٹتی ہے نحوست میں گزرتی ہے

وہ گھبراہٹ ہوں جس میں کوئی بیتابی نہ ہو باقی
وہ مدت ہوں جو بیکاری کی فرصت میں گزرتی ہے

ہنرمند و سلیقہ ور حسین و عشق شیوہ ہوں
مگر ہندوستاں میں ننگِ ہستی ہوں کہ بیوہ ہوں

سرکار خفا ہیں

اک دوست ہیں میرے بڑے ذی فہم و خرد مند
سب سے بڑے آفس کے اسسٹنٹ خداوند

تعطیل تھی کل اُن سے جو ملنے کو گیا میں
کم ہوتا ہے ملنا تو بہت دیر رہا میں

آتے رہے اوّل تو سلامی پہ سلامی
ہوتی رہی تا دیر غلامی کی غلامی

کچھ اہلِ غرض لے کے تحائف ہوئے حاضر
پڑھتے ہوئے کچھ دل میں وظائف ہوئے حاضر

کُرسی پہ لٹک کر کبھی گودوں میں مچل کر
نذرانے لئے بچّوں نے گھر میں سے نکل کر

پھر وحی ہر اک قسم کی جب ہو چکی نازل
فُرصت ہوئی مشکل سے ذرا دیر کو حاصل

اک بات ہوئی خاص، ملاقات میں اُن کی
بسمل کا جو ذکر آیا کسی بات میں اُن کی

دریافت کیا اس کے لئے میں نے یہ اُن سے
ہر چند کہ بگڑے ہوئے تیور تھے کچھ اُن کے

اب آپ کے ہاں آپ کا بسمل نہیں ہوتا
محفل میں وہ اب گرمیِ محفل نہیں ہوتا

وہ ہمدمِ دیرینہ وہ ہمراز کہاں ہے
وہ شاعرِ آزاد وہ جاں باز کہاں ہے

پہلے تو یہ حالت تھی کہ غم خوار تھے دونوں
ہم رنگ و ہم آہنگ و ہم یار تھے دونوں

آپ اُس کے مکاں پر نہ وہ اب آپ کے گھر پر
ہوتا ہے کبھی چائے پہ ملنا نہ ڈنر پر

کیا بات ہے آپس میں وہ اب ربط نہیں ہے
اب آپ کہیں اور ہیں وہ اور کہیں ہے

اوّل تو محبّت کو بڑھانا نہیں اچھا
بڑھ جائے تو پھر اس کو گھٹانا نہیں اچھا

اِس بات کا احساس اُدھر ہے نہ اُدھر ہے
اُس وضع کا اب پاس اِدھر ہے نہ اُدھر ہے

سُنتے رہے وہ بادلِ ناخواستہ سب کچھ
پھر سُن کے مری باتوں کو اُکتا گئے جب کچھ

کہنے لگے اِک راز ہے یہ ترکِ محبّت
اوّل تو محبّت کی نہیں کوئی حقیقت

کچھ میل ملاقات نہ کچھ ربط نہ کچھ ضبط
ان باتوں کو ہم لوگ سمجھتے ہیں نرا خبط

وہ دوستی کیا اُس سے محبّت تھی دوامی
وہ دوستی دراصل سیاست تھی مقامی

ملنے کی ضرورت نہ اِدھر ہے نہ اُدھر ہے
اور دل میں کدورت نہ اِدھر ہے نہ اُدھر ہے

وہ ہم سے نہ ہم اس سے ہی زنہار خفا ہیں
بھئی اصل میں اس شخص سے سرکار خفا ہیں

وہ دوستی اچھی نہ وہ مذہب نہ وہ انساں
سروس کے لئے جس سے ہوا اندیشۂ نقصاں

ہر چند نہ تھی رنجشِ باہم مجھے منظور
کچھ آ ہی گیا حضرتِ بسمل سے یہ مذکور

بشنید و بگفت ایں ہمہ نذرِ مے و ساغر
خندید و بگفت ایں ہمہ بر پشمِ قلندر

اختر شیرانی

چھا گئی رُوح پر اِک غم کی گھٹا تیرے بعد
کتنی تاریک ہے اس دل کی فضا تیرے بعد

اِتنی سُنسان تو یہ بزم ہوئی تھی نہ کبھی
جتنی سُنسان ہے بزمِ شُعَرا تیرے بعد

عشق و مستی کی یہ آہنگِ خیام و حافظ
سازِ اُردو سے نہ نکلے گی صَدا تیرے بعد

اب کہاں وہ ترے اشعار کا رنگیں اسلوب
کون ہو تیری طرح نغمہ سَرا تیرے بعد

کر سکے کون وہ اندازِ روانی پیدا
کس کے شعروں میں ہو رفتارِ صبا تیرے بعد

حسن کو خود بھی نہیں اپنی ادائیں جو نصیب
مِل سکے اب وہ کِسے حُسنِ ادا تیرے بعد

ماند پڑ جائیں گے گُل پیرہنوں کے جلوے
کون دیکھے گا بہاروں کی اَدا تیرے بعد

کرمِ بے حدِ ساقی پہ بھی بدمستی میں
کس کو ہو خسّتِ ساقی کا گلہ تیرے بعد

جس کے ہر جُرعے میں میخانہ اُمڈ آتا تھا
دستِ ساقی میں وہ ساغر نہ رہا تیرے بعد

بارشیں آئیں گی اخترؔ، نہ اُٹھے گی لیکن
اُفقِ جام سے مستانہ گھٹا تیرے بعد

تیرے احبابِ خصوصی کی وفا، کیا کہئے
یاد آئی ہے اُنہیں اپنی وفا تیرے بعد

جیتے جی جس نے نہ ہونے دیا ہم بزم تجھے
گرم اس سے ہے تری بزمِ عزا تیرے بعد

زندگی میں تجھے جس نے نہ پلائی ہو شراب
تیری بخشش کی نہ مانگے وہ دُعا تیرے بعد

ہے تری بے کسئِ عشق کا رونا مُجھ کو
کوئی پرسانِ محبّت نہ رہا تیرے بعد

تیری ریحانۂ شعر اور تری سلمائے شراب
کس کی ہو کر رہیں بسملؔ کے سوا تیرے بعد

عرضِ بیداری

جاگ ، او خانہ بر اندازِ چمن ، خواب سے جاگ !
جاگ ، او جانِ چمن ، نازِ چمن ، خواب سے جاگ
جاگ ، او دولتِ دیدارِ چمن ، خواب سے جاگ !
جاگ ، او قسمتِ بیدارِ چمن ، خواب سے جاگ
جاگ ، او صبحِ نخستینِ چمن ، خواب سے جاگ !
جاگ ، او نزہتِ سیمینِ چمن ، خواب سے جاگ !

مُسکراتے ہوئے بیدار ہوا اے جانِ بہار
تیری بیداری ہی گُلشن میں ہے اعلانِ بہار
کھول کر آنکھ ذرا کھینچ دے تصویرِ بہار
جنبشِ موجِ نظر ہے تری تقدیرِ بہار

ہاں ذرا عارضِ گلگوں کا اثر ہونے دے
رنگ آمیز گل و برگ و ثمر ہونے دے
مہِ رُخسار سے اِس ابرِ حریری کو ہٹا
رنگ جائیں لبِ لعلیں سے گلاب و لالہ

بے کسل کیف ہے اندازِ طرح داری میں
نیند سوئی ہوئی ہے حُسن کی بیداری میں
خواب گہ ہے تری اک جلوہ گہِ لالہ و گل
ہے ترے عارضِ گلگوں پہ ہر اک گل بُلبُل

تجُھے بیدار صَبا کرتی ہے کن چالوں سے
گُدگُدی گالوں پہ کرتی ہے ترے بالوں سے
جاگ اور جاگ کے آثارِ سحر پھیلا دے
رُخِ روشن سے اب انوارِ سحر پھیلا دے

چاند اور چاندنی دونوں کو اجازت دیدے
رات بھر جاگے ہوئے تاروں کو رخصت دیدے
پھول بے تاب ہیں گُلشن میں مہکنے کے لئے
منتظر بیٹھی ہیں چڑیاں بھی چہکنے کے لئے

اُٹھ مسہری سے قدم رنجہ زمیں پر فرما
اوجِ تقدیرِ زمیں چرخِ بریں پر فرما

سبزے کی حسرتِ پابوس نکل جانے دے
اپنے قدموں سے ذرا اُس کو مَسل جانے دے

اُٹھ کے بتلا دے کہ ہے سرو کو کس بات پہ ناز
چل کے دکھلا دے نسیمِ سحری کے انداز

پائے رنگیں کے عطا کر لبِ جو کو بوسے
جگمگا حوض کے آئینے کو عکسِ رُخ سے

حوض میں عکسِ تبسّم کا اثر پیدا کر
مچھلیوں کے لئے پانی میں گہر پیدا کر

دیکھ اِک منتظرِ دید کی اُمّید کو دیکھ
اپنا دیدار دِکھا ، مضطربِ دید کو دیکھ

کروٹیں لے کے نہ ہلچل مِرے جذبات میں ڈال
دلِ معصوم کو للّٰہ نہ آفات میں ڈال

تھی نسیمِ سحری کیا تری انگڑائی میں
جاگ اُٹھی لہر سی اِک باغ کی انگنائی میں

اے وہ خاموش فضاؤں میں تلاطم آیا !
اے وہ انگڑائیاں آئیں ، وہ تبسّم آیا !

تُو جو اے غُنچہ دہن ناز سے ہنس کر جاگی
ہر کلی بن کے گُلستاں کا مُقدّر جاگی

چوری

شاید تری محبّت کوئی چُرا رہا ہے

بن کر نشاط، روحِ محزون پہ چھا رہا ہے
روحِ طرب کی صورت غم میں سما رہا ہے
اشکوں میں مسکرا کر آہوں میں گا رہا ہے

شاید تری محبّت کوئی چُرا رہا ہے

بے سمت و بے جہت اک عالم ہے اور میں ہوں
اک سحر، اک فضائے مبہم ہے اور میں ہوں
جیسے بغیر بھولے کچھ یاد آرہا ہے

شاید تری محبّت کوئی چُرا رہا ہے

راتوں کو نیند بن کر چھپتا ہوا نظر سے
دِل میں مرے سمائے آنکھوں کی رہگزر سے
مجھ کو سُلا سُلا کر خوابوں میں آرہا ہے

شاید تری محبّت کوئی چُرا رہا ہے

مجبورِ شرم و شوقِ الفت مرے لئے ہے
جرأت فزائے دستِ حسرت مرے لئے ہے
آنچل سے منہ چھپائے دامن ٹُھکا رہا ہے
شاید تری محبّت کوئی چُرا رہا ہے

تیرے تصوّروں کا منہ پر نقاب ڈالے
جیسے کسی کے پیچھے خود کو کوئی چھُپالے
اس طرح اپنی صُورت تیری بنا رہا ہے
شاید تری محبّت کوئی چُرا رہا ہے

جس طرح دوست گزرے بیگانہ وار کوئی
اور پھر اُسے پکارے بے اختیار کوئی
میرے قریب ہو کر اس طرح جا رہا ہے
شاید تری محبّت کوئی چُرا رہا ہے

میری طرف تو جیسے لوٹا چکا ہو مُجھ کو
برگشتہ کر رہا ہو تیری طرف سے اَب تو
اس طرح اپنی جانب مجھ کو بُلا رہا ہے
شاید تری محبّت کوئی چرا رہا ہے

چھیڑا ہے سازِ ماہِ کامل فلک پہ جا کر
مسحور کر رہا ہے کرنوں کی لے میں گا کر
بے صوت و بے صدا اک نغمہ سُنا رہا ہے
شاید تری محبّت کوئی چرا رہا ہے

بے التفاتیوں کا جس میں ہے طنزِ نہاں
جس میں مفارقت کا ہرگز نہیں ہے امکاں
وہ مژدۂ وصالِ پیہم سُنا رہا ہے
شاید تری محبّت کوئی چُرا رہا ہے

شاعر

میں شاعر ہوں زمانہ سے جدا انداز ہے میرا
دو عالم سے الگ اک عالم پرواز ہے میرا

ٹھکانہ ہے کوئی اِس مد و جزرِ ذہنِ شاعر کا
کبھی دنیا مری عقبیٰ کبھی عقبیٰ مری دنیا

دلِ ہر حرف سے معنی کی نَے ایسی اُبھرتی ہے
صریرِ خامۂ شاعر پہ فطرت رقص کرتی ہے

کبھی قلبِ مشیت میں مثالِ راز رہتا ہوں
کبھی ذہنِ مشیت میں خللِ انداز رہتا ہوں

قلمرو میں مری تغیُّر ہستی اک بہانہ ہے
فسانہ بھی حقیقت ہے، حقیقت بھی فسانہ ہے

کیا دریوزۂ درگاہِ مفلس میں نے قاروں کو
سَرابِ دشت کر ڈالا ہے اکثر میں نے جیحوں کو

کبھی عشرت گہہِ تخئیل، اندوہِ جہنم ہے
کبھی فردوس میری فکر کی جولانگہِ غم ہے

کبھی میں حُسن کی اک جنبشِ ابرو پہ مرتا ہوں
کبھی میں دشنۂ زارِ عشق سے ہنس کر گزرتا ہوں

کبھی بُلبُل کو گُل اور گُل کو بُلبُل کر دیا میں نے
نیاز و ناز کی ہر شمع کو گُل کر دیا میں نے

سرِ بزمِ تخیل سوچتا رہتا ہوں اکثر میں
جلا دوں شمع کو سوزِ دلِ پروانہ دے کر میں

کبھی یوں حُسن کو میں مبتلائے رشک کرتا ہوں
ہر اک جنبش کو چشمِ سرمہ سا کی اشک کرتا ہوں

خودی کو آرزومندی کی، جب گرما دیا میں نے
نیازِ عشق و نازِ حُسن کو ٹکرا دیا میں نے

غرورِ حُسن کو مامور کر دیتا ہوں سجدوں پر
جبینِ ناز کو مجبور کر دیتا ہوں سجدوں پر

نظر جب جانبِ عجز و نیازِ عشق جاتی ہے
نگاہِ ناز بھی عشوہ طرازی بھول جاتی ہے

مری افکار ہی سے عشق کو اندازِ عشق آئے
وقارِ حُسن کی چتون کے بل میں نے نکلوائے

خمِ گیسوئے زلفِ عنبریں میں حُسن ہے میرا
کمانِ ابرو و چینِ جبیں میں حُسن ہے میرا

بہر چشمِ فسونگر غمزۂ غمّاز ہے میرا
ہر اک اندازِ معشوقانہ میں انداز ہے میرا

سمجھتا ہوں بساطِ نخوت و اندازِ محبوبی
مری نظروں میں ہے اندازۂ ہر نازِ محبوبی

یہ اندازِ نیاز اس عشق کو میں نے بتایا ہے
مجھی سے حُسن میں پندارِ محبوبانہ آیا ہے

سکھایا عشق کو میں نے حریفِ ناز ہو جانا
مگر پھر فتح مندانہ سپر انداز ہو جانا

داستانِ آزادی

رہے جو دو سو برس تلک ہم رہینِ جبرِ فرنگ ہو کر
جمود طاری ہُوا وہ ہم پر کہ رہ گئے خشت و سنگ ہو کر

جو خال و خط میں تھے اپنے مضمر نظر نہ آئے ہمیں وہ جوہر
ہمارے آئینۂ وطن پر پڑی رہی گرد زنگ ہو کر

یہ ذہنیت ہو گئی تھی اپنی ہمیں تو ہے اقتدار حاصل
وطن اور اہلِ وطن رہیں تو بلا سے بے نام و ننگ ہو کر

ہمیں بزرگوں سے جو ملا تھا وراثتہً دوستی کا جذبہ
وہ جذبۂ دوستیٔ باہم رہا جو آپس کی جنگ ہو کر

نظر ہماری نہ رہ سکی تھی خود اپنے ہی نیک و بد پر اُس وقت
گزر گئے تھے ہم اپنے آپے سے مستِ جامِ فرنگ ہو کر

وطن کے بُرجِ شرف میں جن کا قرانِ سعدین تھا ازل سے
ہماری قسمت کے وہ ستارے بدل گئے نحس و ننگ ہو کر

نہ صرف تھے قانعِ غلامی ہمیں غلامی پہ ناز بھی تھا
ہمارے منہ کو تکا ہے برسوں ہماری غیرت نے دنگ ہو کر

بالآخر اٹھے ہمیں سے کچھ لوگ اہلِ ہمّت بنامِ غیرت
تشدّد و جبر و جورِ بیجا کی آمریت سے تنگ ہو کر

اُٹھے تو مانندِ برقِ بیہم وجود سے اُن کے اُٹھ رہی تھیں
نفس کی موجیں خدنگ بن کر نظر کی فوجیں تفنگ ہو کر

پڑے تہلکے جو دشت و در میں تو زلزلے آئے بحر و بر میں
گئے وہ صحرا میں بن کے اژدر سمندروں میں نہنگ ہو کر

حرام آرام اُن پر اتنا اُچاٹ نیندیں یہاں تک اُن کی
"کہ پھاڑ کھانے کو دوڑتا تھا پلنگ اُن کو پلنگ ہو کر"

کماں سے جس طرح تیر نکلیں نیام سے جیسے تیغِ بُرّاں
زباں سے اُن کی جو لفظ نکلے، گئے دلوں تک خدنگ ہو کر

وطن کی دل میں جو لو لگی تھی بھڑک کے شعلہ وہ بن گئی تھی
فروغِ شمعِ وطن کی خاطر جلے ہزاروں پتنگ ہو کر

مثال اُن کی نہ مل سکے گی زمانے بھر کے ستم کدوں میں
اذیتیں جو ملی ہیں اُن کو اسیرِ قیدِ فرنگ ہو کر

مَرے ہیں میدانِ جنگ میں وہ جو حشر جذبات لے کے دل میں
اُٹھیں گے میدانِ حشر میں بھی تو مردِ میدانِ جنگ ہو کر

وطن کی راہوں میں جو بہا تھا وہ خون آخر کو رنگ لایا
کھِلے گُل آزادیٔ وطن کے ہزار اندازِ رنگ ہو کر

بغیر جنگ و سپاہ و لشکر ہوئی وہ فتحِ وطن میسّر
کہ جنگ جویانِ جنگ خو گر پڑے ہیں سکتے میں دنگ ہو کر

وہ دل جو مانندِ سازِ غم تھے صدائے ادر دِاُن کے زیر و بم تھے
وہ دل ہیں نغمہ طرازِ عشرت ربابِ طاؤس و چنگ ہو کر

کھُلی فضاؤں میں سانس لیں اب نشیمنوں میں کریں چراغاں
ہمارا دم گھونٹ کر رکھا ہے قفس نے تاریک و تنگ ہو کر

نہیں ہے یہ جذباتِ جشنِ جمہوریت جو دل سے نکل رہے ہیں
نفس نفس میں اُمنگ بن کر نظر نظر میں ترنگ ہو کر

جو ہم میں پیدا کیے گئے تھے مٹے ہیں وہ تفرقے دلوں کے
ہوئے ہیں صیقل وہ آئینے جو بگڑے تھے بدرنگِ زنگ ہو کر

ملیں نہ کیوں شیخ و برہمن اب ملے ہیں دیر و حرم یہ کہہ کر
"بڑا مزہ اُس ملاپ میں ہی جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر"

نہرو جینتی

آج اک غنچہ کھِلا تھا باغِ ہندستان میں
جو بہار اندر بہار اک گلستاں ہو کر رہا

آج چمکا تھا ستارہ اک افق پر ہند کے
جو فضائے وقت پر اک آسماں ہو کر رہا

آج اک چشمے نے گنگا جل سے پایا تھا جنم
جس کا ہر قطرہ محیطِ بے کراں ہو کر رہا

آج لوحِ ہند پر لکھّا گیا تھا ایک نام
ذکر جس کا داستاں در داستاں ہو کر رہا

آج ہے یومِ ولادت اک عظیم انسان کا
عظمتِ انسانیت کا جو نشاں ہو کر رہا

حسن تدبیر و تدبّر سے جو اپنے عزم میں
زندگی بھر کامیاب و کامراں ہو کر رہا

جانے کس کی مست نظروں سے وہ پیتا تھا کہ جو
ایک رندِ میکدہ پیرِ مُغاں ہو کر رہا

جس نے جسمِ قوم سے روحِ غلامی سلب کی
جسمِ آزادی میں جو روحِ رواں ہو کر رہا

اپنی ہمّت سے رہا جو صلح خواہ و آشتی
کوہ ٹکرانے لگے تو درمیاں ہو کر رہا

ایک اک طاقت بنی دنیا میں اک شیطانِ جنگ
وہ مگر پیغمبرِ امن واماں ہو کر رہا

سخت طوفانوں میں بھی کھیتا رہا کشتی کو وہ
آندھیوں کے زور میں بھی بادباں ہو کر رہا

دشمنوں کے سامنے بن کر رہا کوہِ گراں
دوستوں کے واسطے آبِ رواں ہو کر رہا

اک جواں فکر و جواں ہمّت جواں عزم و عمل
عہدِ پیری تک بھی اپنے وہ جواں ہو کر رہا

کیا مٹائے گی اجل اس کا دوامِ زندگی
ہر نفس جس کا حیاتِ جاوداں ہو کر رہا

بحر و بَر کے قطرے قطرے ذرّے ذرّے میں ہے وہ
کون کہہ سکتا ہے بے نام و نشاں ہو کر رہا

جانے کتنے دورَ تک تاریخِ مستقبل میں لوگ
یہ پڑھیں گے "کوئی اُس کا سا کہاں ہو کر رہا"

وہ جواہر لال نہرو، 'لال' موتی لال کا
جو وزیرِ اعظمِ ہندوستاں ہو کر رہا

غالبؔ

اے شاعرِ یکتا، اسد اللّٰہی و غالبؔ
اے قلزمِ مَوّاجِ معانی و مطالب

تھی فکر میں تیری، پرِ جبریل کی پرواز
تھا ملہمِ غیبی کا ہم آہنگ ترا ساز

ہر فلسفہ و منطق و افسانہ و افسوں
آتے تھے ترے ذہن میں یوں غیب سے مضموں

جس طرح دمِ فکر برستے ہوں مسلسل
میخانۂ تخئیل پہ الہام کے بادل

فطرت کا ہر اک راز تری فکر میں ضم تھا
کیا خامۂ قرطاس ترا لوح و قلم تھا

اسرارِ مشیّت کہیں ہوتے ہیں رقم بھی
کیا تیرے نہاں خانے کا گوشہ تھا عدم بھی

اُس فکر کے عالم میں قلم تیرا رواں تھا
جس فکر کے عالم میں زماں تھا نہ مکاں تھا

پیدا ہے ترے شعر سے اک شرعِ محبت
وہ شرع کہ مستغنیٔ ہر مذہب و ملّت

تھا وحدتِ ادیان کا حامل ترا مسلک
ایمان کا ہر جادۂ منزل ترا مسلک

آتا جو صحیفہ کوئی قرآں کے علاوہ
کچھ اور نہ ہوتا ترے دیواں کے علاوہ

باوصفِ کہن، تازہ مئے نابِ غزل ہے ساقی ترے میخانے کا ساقیِ ازل ہے
اللہ رے یہ نشہ و جوشِ مئے گلفام ساغر ہے ترا میکدۂ حافظ و خیّام
دلّی میں ترے دم سے ہوں جیسے سخن آرا شیراز و سمرقند و صفاہان و بخارا
گویا ترے اشعار میں ہیں تیری زبانی عُرفی و ظہوری و نظیری و فغانی
فردا ترا یوں تھا ترے امروز میں مستور جس طرح رگِ تاک میں افشردۂ انگور
جو نقش نظر میں تھے تری رنگ کے ارژنگ مجموعۂ بے رنگ سے اُردو کے ہیں وہ دنگ
باعث تری شہرت کا ہے اُردو کا وہ دیواں تھا جس میں تجھے مطلع و مقطع بھی نہ آساں
ضوبار ترا کوکبِ عظمت ہے ترے بعد دنیا میں ترے شعر کی شہرت ہے ترے بعد
معراج تو معلوم نہیں تیری غزل کی افلاک سے اونچی ہے زمیں تیری غزل کی
نالوں سے تری نَے کے فلک ہیں متأثر الہام کے نغموں سے مَلک ہیں متأثر

ہر چند کہ جبریلِ امیں کی ہے زباں اور
"کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور"

قرض

گالی گلوچ، طنز و تشنیع سے گزر کر — کتنوں ہی کے تو سر بھی پھڑوا دیے ہیں تو نے
احباب و اقربا بھی بیگانے ہو گئے ہیں — خون اور دلوں کے رشتے تڑوا دیے ہیں تو نے
او بد نصیب قرضے، اے نامراد قرضے — کس کس سے دوستا نے چھڑوا دیے ہیں تو نے
تھے کل جو رُو بہ "قبلہ" ہیں اب قضا بہ "قبلہ" — "کعبے" کی سمت سے منہ مڑوا دیے ہیں تو نے

چاچا کریم خاں سے، ماما ہزاری مل سے
غیروں سے رشتے ناتے جڑوا دیے ہیں تو نے

گرُو نانک

ہر جادۂ دشوار کی منزل نانک　　ہر قلزمِ زخّار کے ساحل نانک
تو ہے وہ موحّد، ترا مسلک ہمہ اوست　　اے وحدتِ ادیان کے حامل نانک

اے خاصۂ بندگانِ یزداں نانک　　پیغمبرِ بے کتاب و قرآں نانک
ملحوظِ خلایق ہے تقدّس تیرا　　اے محسنِ انسانیت انساں نانک

اے صدرِ سرِ بزمِ ہدایت بنیاد　　اے زیب دہِ مسندِ رشد و ارشاد
کیونکر نہ کہیں قوم کا ہادی تجھ کو　　قرآن میں ہے، لِکُلّ قَوْمٍ ہاد

اے خاک نشیں، چشم بر افلاک، گرُو　　اے معتقدِ صاحبِ لولاک گرُو
کیوں کر تری عظمت ہو نہ ہم کو تسلیم　　اے زائرِ بیتِ حرمِ پاک، گرُو

ہے جستجوئے شوق کا یورپ بھی گواہ اور ذوقِ طلب سے عربستاں آگاہ
محروم نہیں نقشِ قدم سے تیرے تحقیق و تلاشِ حق کی کوئی راہ

کیا درس ہے وہ درس جو اقوال میں ہے حکمت سی وہ حکمت ہے جو اعمال میں ہے
وہ قول ہو تیرا کہ عمل ہو نانک بے مثل وہ اِس عالمِ امثال میں ہے

تصویر تری مراقبے میں ہے غرق اب عابد و معبود میں کچھ فصل نہ فرق
بے سمت و جہت ہے ایک عالم اور تو اب غرب رہا غرب نہ اب شرق ہے شرق

اک نورِ تجّر تری تصویر میں ہے اک طورِ تحیّر تری تصویر میں ہے
جھکتی ہے عقیدت سے تخیّل کی جبیں یہ کس کا تصوّر تری تصویر میں ہے

ہر کفر میں ایمان کیا تو نے تلاش ہر شک میں اک ایقان کیا تو نے تلاش
ہونا تھا جسے سارے مذاہب کی روح وہ مذہبِ انسان کیا تو نے تلاش

تعلیم کا تیری جو گیا دَور بدل آیا ہے دماغِ آدمیّت میں خلل
رُخ اِس کا سوئے غرب ہے اُس کا سوئے شرق اے بانیٔ یک جہتیٔ اقوام و ملل

دانندۂ اسرارِ محبّت نانک سرچشمۂ انوارِ ہدایت، نانک
ہیں طورِ زمانے کے قیامت آثار در پیش ہیں آثارِ قیامت، نانک

تیرہ ہے دماغِ انساں، دل تاریک
ہے مذہب و اخلاق کی محفل تاریک
اے مہرِ ضیا بارِ ہدایت نانک
ظلمت کا ہے طوفان تو ساحل تاریک

میخانوں میں گُل ہے شمعِ بادہ، نانک
تاریک معابد ہیں زیادہ، نانک
ظلمت ہے بہر راہ گزارِ انساں
نانک! نانک! چراغِ جادہ، نانک

دم توڑ رہی ہے آدمیّت، نانک
ہے وقت کا دریا کہ قیامت، نانک
بپھرا ہوا طوفان ہے، ٹوٹی کشتی
اس وقت دکھا کوئی کرامت، نانک

اس میں نہ کوئی شُبہ، نہ شک، ریب نہ ریو
رستم ہو کہ سہراب، وہ گودرز کہ گیو
ہیں روح کی طاقت میں کہاں زور آور
مانندِ مہاراج گرو نانک دیو

ایسا کوئی خورشیدِ درخشاں نہ ہوا
اس پانچ صدی میں تو نمایاں نہ ہوا
اے عالمِ انسانیت اب تک تجھ میں
نانک سا کوئی مصلحِ انساں نہ ہوا

ہم کچھ بھی پڑھیں ایک ہے مطلب، پڑھ لیں
اب تک نہ پڑھا کچھ تو چلو اب پڑھ لیں
ویدوں کو تو پڑھ لیں نہ پڑھیں گر قرآں
گیتا نہ پڑھیں، گرنتھ صاحب پڑھ لیں

گھٹ جائے بلا سے عمرِ ہستی گھٹ جائے
یہ عمرِ مصیبت تو الٰہی کٹ جائے
یہ وقت جو بڑھ رہا ہے آگے کمبخت
یہ پانچ صدی کاش کہ پیچھے ہٹ جائے

"آتی ہے ہر طرف سے آوازِ طرِّ قوا کی"

اخبار الجمعیتہ ہفتہ ایڈیشن نے اپنی اشاعت ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۹ء میں اقبال سہیل مرحوم کا یہ شعر:

اے کاروانِ ملّت اُٹھ تو بھی گامزن ہو
آتی ہے ہر طرف سے آوازِ طرِّ قوا کی

بطور طرح دے کر شعراء کو دعوتِ سخن دی اور کلام طلب کیا، اس سے پہلی اشاعت میں کسی اہم تنظیم کے عزم کا اعلان ڈاکٹر اقبال مرحوم کے اِس مصرع سے کیا:

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

مجھے یہ دونوں اعلان کچھ بے وقت کی راگنی کی طرح محسوس ہوئے تو میں نے یہ اشعار کہے۔

فرصت کہاں کہ سوچیں کیوں قوم ہے یہ بھُو کی ۔۔۔ تعمیل کر رہے ہیں ہم لوگ واشربوا کی
فسق و فجور و مستی، اِسراف و خود پرستی ۔۔۔ امواجِ مے ہیں ساری توحید کے سبو کی
اس وقت کا مفسّر کہتا ہے صاف ہم سے ۔۔۔ لاتسرفوا میں تاکید آئی ہے تسرفوا کی
افتادِ طبع اپنی مائل ہے ضد کی جانب ۔۔۔ سرمایہ جہل کا ہے تفسیر اُطلبوا کی
تقدیر نے ہمیں کیوں خیر الاُمم بنایا ۔۔۔ کیا اِس میں بھول اپنی تقدیر خود ہی چوُ کی

در بزمِ نازِ نرگس، بر آستانِ رنتی
تطہیر و اقترب کی، تقدیس و اسجُدو کی

دربندِ قصر ہیں اور احکامِ عزم و ہمت
ہم کو خبر نہیں کچھ بازار و کُو بکُو کی

شاباش، چاک کر دو دامانِ عقل کو بھی
سمجھو ہمارے ذمے تدبیرِ تم رفو کی

مفہومِ آبرو کا سمجھے نہ لوگ اُس وقت
دیتا تھا جب گواہی ایمان، آبرو کی

وہ وقت اور تھا جب ملتی رہی شہادت
شامل تھا جب تشہّد ہر بوند میں لہو کی

خاکِ تیمّم اُن کو شاید نہ تھی میسّر
کرتے تھے شرط پُوری جو خون سے وضو کی

ادیان اور ملل کی وحدت کو جو نہ سمجھا
اُس نے من و شما کی بے وجہ گفتگو کی

یک جہتیٔ مذاہب ہے از دواجِ باہم
اِس دور میں غلط ہے تفریق ما و تُو کی

کہنے کو تھی وہ رُو دیا نکلا زباں سے زہرا
گھونگھٹ میں شکل دیکھی جب ساس نے بہُو کی

اے کاروانِ ملّت، اُٹھ تو بھی گامزن ہو"
ہے یہ صدا جرس کی یا سُرمہ در گلو کی

"ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا"
منزل کی جستجو ہے منزل نہ جستجو کی

یہ کان بج رہے ہیں، کانوں میں جو ابھی تک
"آتی ہے ہر طرف سے آوازِ طُرّۂ قُوا کی"

اب کارواں نہ کوئی سالارِ کارواں ہے
لیکن نقیب ہیں اور للکارِ طُرّۂ قُوا کی

غائب جنازوں کی ہم جیسے پڑھیں نمازیں
ایسی مثال ہے کچھ اِس وقت طُرّۂ قُوا کی

سُنسان مسجدیں ہیں خاموش خانقاہیں
بانگِ اذاں نہ کوئی آوازِ ہائے ھُو کی

اک رندِ مست بے شک کہتا یہ جا رہا ہے
پرچھائیں ہے مخاطب خود اُس کی گفتگو کی

قہر و غضب کی فوجیں حائل ہیں درمیاں کیوں
خود آؤ سامنے تو چوٹیں ہوں دُو بدُو کی

روئے سخن...

اے مدّعیِ سوزِ دروں! تیرے شعر میں
سوزِ دروں کے لفظ ہیں، سوزِ دروں نہیں

سوزِ دروں کا ہے جو ترے دل میں واہمہ
پانی میں عکسِ شعلہ سے ہرگز فزوں نہیں

جو تیری شاعری کے رگ و پے میں ہے رواں
اقبال کا پسینہ ہے وہ تیرا خوں نہیں

شہرت کے سوءِ ہضم سے آشوبِ چشم ہے
خونِ جگر سے آنکھ تری لالہ گوں نہیں

تُو ہے فتورِ مصلحتِ وقت کا مریض
تیرا جنون، عقل کے مارے جنوں نہیں

دیوان تیرا، بادیہ پیمائے شہر شہر
نقشے سے کوہ و دشت و دمن کے فزوں نہیں

اے یادگارِ قیس! بجز شہرِ آگرہ
تیرے جنون کے لیے دشتِ جنوں نہیں

خسرو پرستِ کوہکن! احساس میں ترے
شیریں نہیں ہے تیشہ نہیں، بے ستوں نہیں

آ جائے دامِ زشت میں وہ تیری فکر کے
ایسی تو شاعری کوئی صیدِ زبوں نہیں

اتنا بھی ناسزا نہیں، حالانکہ سچ یہ ہے
یہ دَور، شعر کے لیے خیر القروں نہیں

اے مُطرب و مُغنّی و داد دِہِ بزمِ شعر
دُولاب ہے گلے میں ترے ارغنوں نہیں

ذہنِ عوام کو ہے اک افسونِ شیوع و نشر
ذہنِ خواص کے لئے کوئی فسوں نہیں

توفیق ہو نصیب تو کر عشق، بوالہوس
دل کو بغیرِ عشق میسر سکوں نہیں

"ہر چند عقلِ کُل شدہ اِی بے جنوں مباش"
کچھ بھی نہیں جو عقل کے شامل جنوں نہیں

منسٹر ہو جانے پر......

دل میں جذبہ خیر کا شر میں بدل کر رہ گیا
روح کا رُخ اپنے پیکر میں بدل کر رہ گیا

تھا شرافت کی جو قسمت، جو محبّت کا نصیب
وہ سیاست کے مقدر میں بدل کر رہ گیا

مسند آرا عرشِ عظمت کا، خود اک دورِ دوام
وقت کی کرسی کے چکر میں بدل کر رہ گیا

ہائے عہدِ بے زمان و وائے دورِ لازوال
ایک میعادِ مقرر میں بدل کر رہ گیا

وہ طلوعِ آفتابِ صبح کا سیمیں سماں
شام کے سورج کے منظر میں بدل کر رہ گیا

شاید اپنا نام سُنکر اب مخاطب بھی نہ ہو
اِس طرح اک شخصِ دیگر میں بدل کر رہ گیا

ہائے اُس کی قدر و قیمت وائے اُس کی آب و تاب
ایک ہیرا تھا جو کنکر میں بدل کر رہ گیا

جس میں تھی آنسو کی نرمی آہ کا جس میں گداز
ہائے وہ دل، آہ پتھّر میں بدل کر رہ گیا

یوں کہاں آنسو کہاں گوہر مگر با ایں ہمہ
وائے وہ آنسو جو گوہر میں بدل کر رہ گیا

اک لبِ بے عذر اُس پر یہ چناں اور یہ چنیں
'کس طرح' 'میں' 'کیوں' 'میں' 'کیونکر' میں بدل کر رہ گیا

یا وہ کیفِ ذوق تھا یا اب یہ بے کیفیٔ شوق!
اک کلب جیسے کسی گھر میں بدل کر رہ گیا

اب طبیعت میں کہاں کیفیتِ شعر و شراب
بادۂ گلرنگ ساغر میں بدل کر رہ گیا

رہ گئے ہو کر منسٹر آہ بسمل ایک دوست
ہائے کیا میخانہ دفتر میں بدل کر رہ گیا

اگر یہ میخانہ ہے وہی، تو کہو وہ رندِ جواں کہاں ہے
وہ رندِ روحِ روانِ بادہ، وہ جانِ بادہ کشاں کہاں ہے

اگر چمن یہ وہی چمن ہے جو زیرِ ابرِ بہار تھا کل!
کہاں ہے ابرِ بہار اب وہ بہار کا سائباں کہاں ہے

اگر زمیں یہ وہی زمیں ہے اک آسمانِ طرب تھا جس پر
تو اس زمیں کی فضاؤں کا وہ طرب چکاں آسماں کہاں ہے

اگر یہ مشرق وہی ہے جس سے طلوع ہوتا تھا مہرِ انور
کہاں ہے وہ مہرِ انور اُس کے طلوع کا وہ سماں کہاں ہے

اگر یہ وادی وہی ہے وادی بہار کا جس میں کارواں تھا
کہاں ہے وہ نزہتِ بہار اب وہ ضامنِ کارواں کہاں ہے

اگر یہ آتش کدہ وہی ہے جہاں تھے آتش پرستِ اُلفت
دھواں دھواں کیوں فضا ہے اس کی فروغِ شعلہ فشاں کہاں ہے

اگر یہی ہے وہ صحنِ گلشن جو تھا نسیم و صبا کا مسکن!
روش روش پر کہو وہ مستِ خرام سروِ رواں کہاں ہے

یہ شہر خوبانِ حسن کا ہے؛ دلوں پہ تھے حکمراں جو خوباں
تو وہ جو خوبانِ حکمراں کے دلوں پہ تھا حکمراں کہاں ہے

وہی ہے بازارِ حُسن اگر یہ جو مثل بازارِ مصر کا تھا
تو ماہِ کنعاں کہاں ہے اِس میں وہ یوسفِ دلستاں کہاں ہے

جبینِ نخوت سرشت کو بھی غرور تھا جس کی بندگی پر
یہ آستاں ہے وہی تو آخر وہ صاحبِ آستاں کہاں ہے

یہ بزم اگر ہے وہ بزم جس میں نہ فرقِ مہمان و میزباں تھا
تو اب یہ مہمان ہم ہیں کس کے کہاں ہے وہ میزباں کہاں ہے

اگر یہ مندر وہی ہے مندر پرستشِ جسم و جاں کا معبد
تو جس کی ہم آرتی اُتاریں وہ کعبۂ جسم و جاں کہاں ہے

اگر یہ گوڑ گاؤں بھی وہی ہے جو حسن اور عشق کا تھا گوکل
تو پھر خدا کے لیے بتاؤ "مرا" "کنہیا"[1] یہاں کہاں ہے

(گوڑ گاؤں)

[1] کنہیالال پوسوال منسٹر ہریانہ

شام

شام کا یہ منظرِ رنگیں، یہ رنگِ آفتاب
طشتِ زرّینِ شفق پر جس طرح جامِ شراب

جیسے گل اندام کوئی چمپئی ملبوس میں
شمعِ روشن جس طرح یاقوت کے فانوس میں

لالہ گوں ماحول میں یہ روئے مہرِ گلعذار
جیسے میخانے پہ چھایا ہوا ابرِ بہار

شام کے سائے کا سرخی پر شفق کی اشتباہ
عارضِ گلگوں پہ جیسے پرتوِ زلفِ سیاہ

جھٹپٹے میں شام کے یوں ہے شفق گوں آفتاب
سنبلستاں میں کھلا ہو جس طرح کوئی گلاب

کہکشانِ رنگ رنگ، ایک اک شعاعِ زرنگار
رُوکشِ صبحِ گلستانِ ارم شامِ بہار

کیا مقابل ہو فروغِ بادۂ گلفام سے
صبحِ فردوسِ بریں شرمندہ ہے اس شام سے

حُسنِ بے پردہ کی عُریانی نہیں ہے شام میں
صبح کے جلووں کی ارزانی نہیں ہے شام میں

ہے طلوعِ صبح بھی مضمر غروبِ شام میں
صبح کا آغاز بھی ہے شام کے انجام میں

صرف تاریکی ہی تابانی کی ہے وجہِ نمود
ہے اودھ کی شام سے صبحِ بنارس کا وجود

کہکشاں میں بیٹھ کر جپنے کو مالا رام کی
بت کدے کی صبح سے آتی ہے دیوی شام کی

نجد میں کیا دیکھنا، دیکھے تو اپنے دل میں دیکھ
لیلیٰ فطرت کو مجنوں کی طرح محمل میں دیکھ

چھوڑ نظّاروں کے اذنِ عام کو، دعوت میں آ
صبح کی جلوت سے اُٹھ کر شام کی خلوت میں آ

ابتدائے صبح بھی منتج ہے اِس اتمام پر
ختم فطرت کی رسالت ہے رسولِ شام پر

ہولی

ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے — کیفیتِ نشاط دو عالم پہ چھائی ہے
تاروں سے جو فضائے فلک جگمگائی ہے — پھولوں سے گلستاں کی زمیں مسکرائی ہے
ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے

ہے غرق کائنات مسرت کے رنگ میں — عالم ہے رنگِ عیش میں عشرت کے رنگ میں
دنیا نہا رہی ہے محبت کے رنگ میں — ہر دل میں رنگ بن کے محبت سمائی ہے
ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے

قوسِ قزح چمن پہ ہے یا آبشارِ رنگ — رنگِ بہار کہیے اسے یا بہارِ رنگ
موجِ شمیمِ گُل ہے کہ اک جوئبارِ رنگ — کس رنگ سے بہار گلستاں میں آئی ہے
ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے

گُل ریز و گُلفشاں جو عبیر اور گلال ہے　　جو چیز جس جگہ ہے سراسر جمال ہے
گلگوں ہوئی ہے دھوپ تو سایہ بھی لال ہے　　تہوار بن کے لال پری جیسے آئی ہے
ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے

رنگیں تمام کوچہ و بازار ہو گئے　　ذرّات، خاکِ راہ کے گُلنار ہو گئے
گُل رنگ و گُل فشاں در و دیوار ہو گئے　　یاروں نے دھوم دھام سے ہولی منائی ہے
ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے

ہر دل میں اک اُمنگ نئی ہے نئی ترنگ　　رقصاں ہے عضو عضو، تھرکتا ہے انگ انگ
یوں کھیلتے ہیں رنگ نگارانِ شوخ و شنگ　　نس نس میں جوت جذبۂ دل نے جگائی ہے
ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے

اک سیلِ رنگ و نور سے اُلجھے جو اک حضور　　پھر خود بڑھا جو اُن کی طرف سیلِ رنگ و نور
پھینکا گُلال اُس پہ مگر رہ کے اُس سے دُور　　ہولی ہُوئی تمام پکارے دُہائی ہے
ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے

مستِ نشاط ہو کے ہوا جھُومنے لگی　　رقصاں ہُوئی ہوا تو فضا جھومنے لگی
لہرا کے خود فضا میں صدا جھُومنے لگی　　گوکُل میں جیسے کرشن نے بنسری بجائی ہے
ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے

خورشیدِ نو ہُوا اُفقِ صبح سے طلوع　　کرنیں ہیں جس کی اک شجرِ عیش کی فروع
اک عہدِ نو کا دورِ مسرت ہوا شروع　　تبریک و تہنیت سے فضا گُنگُنائی ہے
ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے

اک وقت تھا کہ کھائی ہیں سینوں پہ گولیاں   بھر دی گئی ہیں کانٹوں سے پھولوں کی جھولیاں

کھیلی ہیں اپنے خون سے جب ہم نے ہولیاں   وہ ناگوار یاد دلوں سے بھلائی ہے

ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے

رندوں کو آ رہا ہے نظر میکدہ نیا   محسوس کر رہی ہے طبیعت نشہ نیا

ساقی دکھا رہا ہے کوئی معجزہ نیا   یا کہنہ ساغروں میں نئی مے پلائی ہے

ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے

یک جہتی خیال کا مژدہ سنائے گی   من و امانِ عام کے نغمات گائے گی

بھارت پہ عشرتوں کی گھٹا بن کے چھائے گی   بن کر نویدِ عیش و مسرت یہ آئی ہے

ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے

ہے اک نئی بہار چمن بھی نیا ہے آج   معلوم ہو رہا ہے وطن بھی نیا ہے آج

کیا تازگی ہے رنگِ کہن بھی نیا ہے آج   بسمکل عروسِ وقت نے مہندی رچائی ہے

ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے

عید الفطر

فرازِ عرشِ بریں منوّر، فضائے فرشِ زمیں معطّر
زہے یہ نورِ نجوم واختر، خوشا یہ رنگِ بہشت منظر
فلک پہ انوارِ عرش برسے، پڑا زمیں پر فلک کا پرتو
ہر اک ستارے ہر ایک ذرّے میں جیسے حُسنِ ازل کی اک ضو
شفق میں برقِ تبسّم ایسی ٹھہر گئی ہے چمک یہ کیسی
جبینِ روشن یہ عرش کی سی یہ شمع محراب کعبہ جیسی

یہ ماہِ نو عیدِ فطر کا ہے کلیدِ درہائے نور و نزہت
پیامِ دلشاد و شادمانی نویدِ عیش و نشاط و عشرت
بہشت احساس ہیں فضائیں طرب فزا انبساط آگیں
نظر نظر ہے سرور افزا، نفس نفس ہے نشاط آگیں

بہار آئی ہے رنگ بن کر، اُمنگ بن کر ترنگ بن کر

دلوں کا ہر تار بج اُٹھا ہے رباب و طاؤس و چنگ بن کر

ہنسی کے سازوں خوشی کے نغمات میں چاند رات گذری

حسین راہوں سے کہکشاں کی سرور آرا برات گذری

یہ صبحِ عیدِ سعید آئی دلوں کی ظلمت کا نور بن کر

ہمہ مسرت تمام رحمت دل و نظر کا سرور بن کر

طلوعِ صبحِ طرب مبارک، مبارک آیا یہ عید کا دن

ہزاروں لاکھوں دلوں کے ارماں و انتظار و اُمید کا دن

یہ دن ہے وہ دن کہ آج کے دن دلوں سے ملتے ہیں دل ہمارے

مثال و مانندِ غنچہ ہائے بہشت کھلتے ہیں دل ہمارے

یہ دن ہے وہ دن کہ آج کے دن دلوں نے غم کو بھلا دیا ہے

مگر یہ کس دل سے کہہ سکیں ہم کہ تم نے ہم کو بھلا دیا ہے

بھلا دیں شکوے شکایت اِس دن منائیں عید اب گلے ملیں اب

پڑے ہیں جو بند مدتوں سے دلوں کے غنچے وہ سب کھلیں اب

اگر محبّت کے راستوں پر بڑھیں گے دل تو قدم بڑھیں گے

ہماری جانب کو تم بڑھو گے تمہاری جانب کو ہم بڑھیں گے

ہمیں تمہاری جو دید ہو گی تمہیں ہماری جو دید ہو گی

وہ عید دراصل عید ہو گی کہ دید ہو گی تو عید ہو گی

نہ عید تم بن نہ عید ہم بن کہیں ہو تم اور ہم کہیں ہیں

یہ عید کیا ہے کہ عید کے دن کہیں ہو تم اور ہم کہیں ہیں

یہ کیا ستم ہے کہ ہم یہ عیدیں منا رہے ہیں بہا کے آنسو
غضب خدا کا تمہاری صورت بنی ہے آنکھوں میں آ کے آنسو

مفارقت کے غموں سے جب تک یہ اشک آنکھوں سے بہہ سکیں گے
خوشی سے تم بھی نہ رہ سکو گے خوشی سے ہم بھی نہ رہ سکیں گے

ہر ایک غم اپنا مشترک ہے ہر اک خوشی اپنی مشترک ہے
ہر ایک غم میں ہر اک خوشی میں یہ زندگی اپنی مشترک ہے

جو عید ہوگی تمہیں مُبارک وہ عید ہوگی ہمیں مبارک
جو عید ہوگی ہمیں مبارک وہ عید ہوگی تمہیں مبارک

جو دل سے دل کو ہے اک تعلق، کبھی نہ چھوٹا نہ چھوٹ سکتا
دلوں کا رشتہ محبتوں کا کبھی نہ ٹوٹا نہ ٹوٹ سکتا

خلافِ وحدت قبول ہرگز کوئی بہانہ نہ ہو سکے گا
دلوں میں جب تک دُوئی رہے گی ادا دوگانہ نہ ہو سکے گا

سیاسی یزید

غمِ اُمّت خوشی ہے اِن کے لئے ۔۔۔ یہ محرّم کو عید کرتے ہیں
کر سکا جو نہ شمرِ ذی الجوشن ۔۔۔ یہ سیاسی یزید کرتے ہیں
کہہ کر اسلام، کفر پیش کریں ۔۔۔ شہد سے مے کشید کرتے ہیں
ظاہر اپنے کو بُزدل، ابن الوقت ۔۔۔ خالد ابنِ ولید کرتے ہیں
کُفر کرتے تو ہیں سبھی کافر ۔۔۔ کفر سے یہ مزید کرتے ہیں
اُف سیاست کا جامۂ احرام ۔۔۔ کیسی قطع و برید کرتے ہیں
بُت بنانے کو شخصیت اپنی ۔۔۔ کعبے کو یہ شہید کرتے ہیں
ساتھ کفّار کے خلافِ دیں ۔۔۔ کیسی گفت و شنید کرتے ہیں
ہو جو زنّار رشتۂ تسبیح ۔۔۔ اُس کو حبل الورید کرتے ہیں
خود کو کُفّار کے علی الرغم آہ ۔۔۔ پئے مسلم شدید کرتے ہیں
کرتے ہیں جب حلف ادائے دین ۔۔۔ بے کلامِ مجید کرتے ہیں
جا کے کعبے میں بولتے ہیں جھوٹ ۔۔۔ کیا وکالت پلید کرتے ہیں
اپنی لیبارٹری ہیں حکمت کی ۔۔۔ ہر مضر کو مفید کرتے ہیں

جس کو دیکھیں مُذبذب مذہب — اُس کو خبث الحدید کرتے ہیں

بیچ کر آبروئے مذہب و قوم — کوئی عہدہ خرید کرتے ہیں

جن سے حیوانیت بھی ہے مایوس — یہ انہیں سے اُمید کرتے ہیں

ان کی غیروں سے ہو اگر ان بن — نرم گفت و شنید کرتے ہیں

ہو اگر اختلاف اپنوں سے — اختلافِ شدید کرتے ہیں

اُس کی سُنتے ہیں جس کو کچھ دیکھیں — دید کر کے شنید کرتے ہیں

ہنہناتا ہے ان پہ جب کوئی — کس قدر نرم لید کرتے ہیں

کام حکّام کا جو ہو تو صَرف — مدّتِ بے مدید کرتے ہیں

اور اگر آ پھنسے غریب کوئی — اُس کی مٹّی پلید کرتے ہیں

مبتلائے عذاب رکھنے کو — اپنے وعدے وعید کرتے ہیں

اُف کہ مستقبلِ قریب کو یہ — کیسا ماضی بعید کرتے ہیں

نام سے یہ اُڑا کے سیّد و خاں — نسل کو دُم بُرید کرتے ہیں

عرس میں جا کے یہ نظام الدین — پیسہ کو بھی مُرید کرتے ہیں

اک اذاں سے یہ تا اذانِ دگر — انتظارِ شدید کرتے ہیں

اور منسٹر جو آئے وقتِ نماز — اُس کو خوش آمدید کرتے ہیں

جمعِ تاخیر کے بہانے سے — دیر یہ کچھ مزید کرتے ہیں

عصر و مغرب عشا کو پڑھ کر یہ — اجتہادِ جدید کرتے ہیں

اپنے ناپاک سجدوں سے ناپاک
مسجدوں کو پلید کرتے ہیں

آہ صولتؔ

(بروفاتِ صدیقی مولانا سیّد محمود الحسن صولتؔ ٹونکی)

حبسِ دوامِ غم کے سزاوار مر گئے
ناشادِ زندگی کے گرفتار مر گئے

سمجھے ہوئے تھے موت میں جو زندگی کا راز
تھے موت کے جو محرمِ اسرار مر گئے

کیا کارواں کا ذکر سرِ رہگزارِ عشق!
اِس رہگزر میں کارواں سالار مر گئے

اخفائے رازِ عشق میں عمریں گزار دیں
مرنے پر آئے تو سرِ بازار مر گئے

دیکھا جو اپنے خون کے پیاسوں کو تشنہ لب
لب تشنہ زیرِ خنجرِ خونخوار مر گئے

جیسے گناہِ شوق کو رحمت پہ ناز ہو
توبہ کئے بغیر گنہگار مر گئے

اب کیا غرورِ جنسِ ادا و متاعِ ناز
بازارِ حُسن! تیرے خریدار مر گئے

جلوؤں کے آئینوں میں خود اپنا جمال دیکھ
اے حُسن! تیرے طالبِ دیدار مر گئے

ہنگامہ زارِ حشر ہے اک شہرِ خامُشاں
شوریدگانِ کوچۂ دلدار مر گئے

زندہ تھیں جن کے دم سے روایاتِ میکدہ
ساقی وہ تیرے مست وہ میخوار مر گئے

کوئی سرِ نیاز نہ کھائے گا ٹھوکریں ۔۔۔ اے آستانِ ناز، پرستار مر گئے

اے دارِ ضربِ درہم و دینار، حیف ہے ۔۔۔ گور و کفن کی فکر میں نادار مر گئے

مرہم کی آرزو میں لبِ زخم وا کیے ۔۔۔ کتنے جگر فگار و دل افگار مر گئے

مہرِ حیات! دیکھ دریچے سے قصر کے ۔۔۔ کچھ لوگ زیرِ سایۂ دیوار مر گئے

حیوانیت کے زیرِ علم رہ کے سرنگوں ۔۔۔ انسانیت کے تھے جو علمدار مر گئے

بستے تھے دل کے دیس میں دو چار پانچ لوگ ۔۔۔ پھر کیا رہا جو اُن میں کبھی دو چار مر گئے

او نامراد اب نہ کسی غم سے کھیلنا ۔۔۔ اے دل بہوش باش کہ غم خوار مر گئے

اے وائے مرگِ حضرتِ صولت، بقولِ میرؔ ۔۔۔ جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے

ذی علم و فہم، صاحبِ فن، قادر الکلام ۔۔۔ نبّاضِ فکر، ناقدِ اشعار مر گئے

دلدادۂ قدامت و خلق و خلوص و خیر ۔۔۔ ساتھ اپنے لے کے کتنی ہی اقدار مر گئے

مر مر کے جی رہے تھے غم سے بتدریج ہر نفس ۔۔۔ اب موت آ گئی تو بیک بار مر گئے

تھا دشمنوں کی موت کا بھی ذکر ناگوار ۔۔۔ یہ کیا کیا کہ خود ہی مرے یار مر گئے

بسملؔ ہم اپنی خیر منائیں گے کب تلک
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

مسیح الملک حکیم اجمل خاں شیدا

مسیحِ قوم و ملّت، اے مسیح الملک اجمل خاں
تری ذاتِ گرامی تھی متاعِ نوعِ انسانی

سریرِ سلطنت کیا، بوریا تختِ سلیماں تھا
تری وضعِ فقیری میں بھی تھی وہ شانِ سلطانی

بیاں کیا تیری عظمت، اے عظیم المرتبت کیجے
جھکا دیتی تھی عظمت تیرے در پر اپنی پیشانی

وہ ہیں دفتر کے دفتر جو ترے احساں ہیں طب پر
ترے نسخوں کا ایک اک حرف تھا اک طبِّ احسانی

ہر اک کی نبض میں اک نورِ صحت دوڑ جاتا تھا
ترے دستِ شفا میں تھی یدِ بیضا کی تابانی

بھلا تیرے مریضوں کو اجل کا خوف کیا ہوتا
اجل کرتی تھی خود تیرے مریضوں کی نگہبانی

فرشتہ موت کا پر مار سکتا کیا مجال اُس کی
درِ دارالشفا پر تھی مسیحائی کی دربانی

جسے تشخیص کہتے ہیں وہ پا اندازِ مسند تھی
حذاقت، خدمتِ عالی میں تھی صرفِ مگس رانی

خوشا تدبیر، حکمت ہو گئی خود شاملِ صحت
مطب میں عقل پہنچی تھی کسی دن ہو کے دیوانی

سیاست میں دکھائے وہ کرشمے تیری حکمت نے — کہ دانائیٔ فرنگی کی ہوئی بدتر ز نادانی

ترا ذہنِ رسا تھا رازداں شاید مشیّت کا — تری ہر فکر میں شامل رہی تائیدِ یزدانی

سہاگے سے نکھر جاتا ہے جیسے رنگ سونے کا — ہوئی تاریخِ آزادی کی زینت تیری قربانی

ترے دولتکدے پر جمع ہو جاتے تھے سب آکر — جواہر، جوہر و آزاد، انصاری و سبحانی

ملا دے جو نہ ڈانڈے کفر اور اسلام کے باہم — ترے مسلک میں گویا کفر تھی ایسی مسلمانی

رگوں میں کانگرس کے خون ہے اب تک رواں تیرا — مگر کچھ اس طرح، ہونے لگا ہو جیسے اب پانی

عروقِ اوردہ میں خون، پانی ہو ہی جاتا ہے — لہو کو گرم رکھ سکتی نہیں رگہائے شریانی

بیاں کیا وصف تیری شاعری کے ہو سکیں شیدا — تجھے تسلیم کرتے تھے سبھی دلّی کا خاقانی

خوشا وہ وقت جب ثانی ہوا تو اپنے آبا کا — بدا قحط الرجال اب کون ہو تیرا یہاں ثانی

تجارت کے لیے سو طبیہ کالج بنا دیں گے — نہ ہوں گے خیر کے جذبے سے ہم ایک اینٹ کے بانی

قیامت تک رہے گلپوش، جنّت کی بہاروں سے
تری تُربت یہ فرماتی رہے رحمت گل افشانی

خلیفۃ الارض

خدائے اَرض و وَرائے سماوات — منزّہ کیف و کم سے ہے تری ذات
مگر یہ تیری دنیا، اور یہ انساں — نظر آتے ہیں کیا خوابِ پریشاں
نہ یہ قانونِ قدرت کے مطابق — نہ وہ منشائے فطرت کے مطابق
نہ صبح و شام و روز و شب کے وہ دَور — نہ اخلاق و تمدن کے ہیں وہ طَور
کروروں سال، کُن کو ہو چکے ہیں — یہاں کے کارفرما سو چکے ہیں
رہی دُنیا نہ اب شہ کارِ قدرت — نہ وہ انسان، حقدارِ خلافت
اب اس دنیا اور اس دنیا کی بابت — نہیں اس کے سوا کوئی حقیقت

عناصر اس کے سارے سڑ چکے ہیں
تری دنیا میں کیڑے پڑ چکے ہیں

عہد وپیمان

اگر ہماری رگوں میں خوں ہے ہماری نسلی نجابتوں کا
اگر لہو میں ہے جوشِ غیرت ہمارے آبا کی عظمتوں کا

اگر ہے کچھ شرمِ آدمیت لحاظ کچھ ملک وقوم کا ہے
اگر ہمارا ہے دھرم کوئی، اگر ہمارا کوئی خدا ہے

تو اے شہیدانِ ملک وملت بھلا نہ دینگے ہم اس قسم کو
کہ محو ہونے نہ دیں گے ہرگز دلوں سے اپنے تمہارے غم کو

تمہاری جانیں گئی نہیں ہیں ہمارے جسموں میں آگئی ہیں
ہمارے جذباتِ عالیہ کی ہزاروں قسموں میں آگئی ہیں

ہماری آئندہ زندگی کو گئے ہو درسِ ثبات دے کر
پیا ہے جامِ وفات تم نے ہمیں پیامِ حیات دے کر

تو اے بے رنج ہیں ہمارے تمہاری روحیں سما گئی ہیں
ہم ایک افسانہ تھے وہ ہم میں حقیقتیں بن کے آگئی ہیں

ہم آج کرتے ہیں عہد تم سے یہ تم سے پیمان کر رہے ہیں
یہ عہد وپیمان جس میں شامل ہم اپنا ایمان کر رہے ہیں

تمہارے کنبے بہ حالِ زار وسقیم ہرگز نہ رہ سکیں گے
تمہارے بچے یتیم ہو کر یتیم ہرگز نہ رہ سکیں گے

وہ اپنی تعلیم وتربیت میں ہمارے بچوں کے ساتھ ہوں گے
ہمارے بچوں کی طرح ان کے ہمارے ہاتھوں میں ہاتھ ہوں گے

ہمیشہ ہولی منائیں گے وہ مچا کے دھوم اور رنگ رلیاں
کوئی دِوالی نہ ہوگی ایسی کہ اُن کے گھر میں نہ ہو چراغاں

جو عید آئے گی ان کے گھر میں خوشی کا پیغام لائیگی وہ
ہمیں رُلائے تو وہ رُلائے مگر انھیں تو ہنسائے گی وہ

بھلا کر اپنے غموں کو ان کی ہر ایک پوری خوشی کریں گے
ہم اپنے گھر میں اندھیرا رکھ کر تمہارے گھر روشنی کریں گے

جوان ہو کر تمہارے بچے جوانِ صالح، سعید ہوں گے
بھگت سنگھ ان میں ہزاروں ہونگے، ہزاروں عبدالحمید ہوں گے

کبھی نہ مغموم کر سکے گا انھیں تمہارا غمِ جدائی
تمہاری ماؤں کے ہم ہیں بیٹے تمہاری بہنوں کے ہم ہیں بھائی

وہ اپنے غم میں ہمارے غم کی جب آگ محسوس کر سکیں گی
تمہاری بیوائیں بیوگی کو سہاگ محسوس کر سکیں گی

یہ مسجدیں یہ تمھارے مندر تمھارے گرجا یہ گردوارے — عقیدتوں کے عبادتوں کے رہیں گے مرکز یہ سب تمھارے

تمھاری یادیں دلوں میں اپنے بسا کے یادِ خدا کریں گے — ہم اپنی پیشانیوں سے ان میں تمھارے سجدے ادا کریں گے

وہ خلدِ ارضی کہ جس سے ہو کر گئے ہو تم خلدِ آسماں میں — وہ خلدِ ارضی کہ نام جس کا بہشتِ کشمیر ہے جہاں میں

ہمارے ہوتے اگر کسی کی نگاہِ گرم اس طرف اٹھے گی — تو قبر اس کی بجز جہنم کہیں نہ دنیا میں بن سکے گی

وطن یہ ہندوستاں تمھارا یہ ملک، باغ و بہارِ عالم — نثار رعنائیوں پہ جس کی تمام نقش و نگارِ عالم

یہ باغ وہ ہے کہ جس کے پھولوں میں رنگِ الفت وفا کی بو ہے — یہ بحر وہ ہے کہ جس کا پانی سمندروں کی بھی آبرو ہے

یہاں جو انساں ہیں رام ایسے وہ لکشمن سے جری جواں ہیں — یہاں جو مریم سی ہیں مقدس تو پاک سیتا سی دیویاں ہیں

یہیں کے انساں تھے جو خدا نے فرشتے سارے بنا دیے ہیں — اسی زمیں کے فلک نے ذرّے اٹھا کے تارے بنائے ہیں

تمام عالم میں علم و دانش جہاں سے پھیلا یہ ہے وہ مکتب — یہیں کی تہذیب ہے وہ جس سے دیارِ وحشی ہوئے مہذب

یہیں سے حکمت کے فلسفے کے ہزاروں چشمے اُبل اُبل کر — وہ خاکِ یونان تک پہنچے تو ان کو سمجھا گیا سمندر

وہ مدرسہ ہے یہ جس کے درسِ ازل میں مفہوم ہے ابد کا — کہ لوحِ ماضی پہ اِس کی، عالم تمام مرقوم ہے ابد کا

اِسی کے منتر تو پڑھ کے سائنس اپنا جادو جگا رہا ہے — اُڑا کے اِس کے اُڑن کھٹولے جہاز اپنے اُڑا رہا ہے

دماغ اس کا جو عینِ حکمت تو دل ہے اس کا ہمہ محبت — آہیانہ جو روح اس کی تو جسم اِس کا تمام طاعت

تو یہ تمھارا وطن یہ بھارت شہید جس کے لیے ہوئے تم — جسے ہماری سپردگی میں بطورِ میراث دے گئے تم

تمھاری میراث آنے والی تمھاری نسلوں کی ہے امانت — اور اس امانت کی ہم کریں گے بجان و ایمان و دل حفاظت

ہم آج کرتے ہیں عہد تم سے یہ تم سے پیمان کر رہے ہیں
یہ عہد و پیمان جس میں شامل ہم اپنا ایمان کر رہے ہیں

ہم اور منائیں عیدِ محرّم کے باوجود
لعنت ہے اُس خوشی پہ جو ہو غم کے باوجود

اک آہ ہر نظر ہو تو نغمہ ہر اک نفس
لب مُسکرائیں دیدۂ پُرنم کے باوجود؟

انفاس میں ہو رُوح فزا اک نشاطِ عیش
احساسِ جاں گدازئ ماتم کے باوجود؟

شادابئ ہوائے بہشت اور نفس نفس
رگ رگ میں شعلگئ جہنم کے باوجود؟

اک جبر وہ سکوں ہے جو ہو ناگزیرِ قلب
تخئیل میں تلاطمِ پیہم کے باوجود

کیا قہر ہے کہ باغ کو دے باغباں یہ حکم
غنچے کھلیں خزاں کے بھی موسم کے باوجود

ممکن ہے کیا کہ بل کوئی بردیہ بھی نہ آئے
آشفتگئ کاکلِ پُرخم کے باوجود؟

ذلّت سمجھ سکیں گے نہ عزّت کو اپنی ہم
توہینِ فخرِ عالم و آدم کے باوجود؟

ہم پر ہے عبدیت کے نشاں کا وقار فرض
حریتوں کی عظمتِ پرچم کے باوجود

اک فرضِ اولیں ہے ازل سے الست کا
حُبِّ وطن کے فرضِ مقدّم کے باوجود

ہے عہدِ ربط، روح سے بھی اپنا اُستوار — دل سے وفا کے عزمِ مصمّم کے باوجود

دل سے قبول حُرمتِ گنگ و جمن، مگر — بے حُرمتیٔ کوثر و زمزم کے باوجود؟

پاکیزگیٔ دامنِ سیتا بجا، مگر — آلودگیٔ دامنِ مریم کے باوجود؟

ہم بے نیازِ سود و زیانِ جہاں بھی ہیں — ہر لحظہ فکرِ بیش و غمِ کم کے باوجود

احساسِ فرضِ عشق ہے تحت الشعور کو — بے ہوشیوں کے امرِ مسلّم کے باوجود

ایسے بھی کچھ مقام ہیں جن میں ہم اہلِ عشق — ہیں مجتمع رقابتِ باہم کے باوجود

عُشّاقِ فرد فرد بھی کچھ منتشر نہیں — اغیار کے گروہِ منظّم کے باوجود

دیوانگانِ عشق سے ڈریئے کہ ہیں یہ لوگ — شعلہ شعار، شیوۂ شبنم کے باوجود

اے بزمِ ناز، تجھ میں اگر ہم نہ رہ سکے — اِس صورتِ نگینہ و خاتم کے باوجود

تجھ کو بھی پھر کہیں کوئی عالم نہ ہو نصیب — عالم کے باوجود دو عالم کے باوجود

یہ مُطلق العنان شہنشاہیاں تو دیکھ — جمہوریت کے دعویٔ محکم کے باوجود

دل میں پڑے ہیں زخم جو توہینِ عشق کے
بسملؔ وہ بھر سکیں گے نہ مرہم کے باوجود

آبشارِ اشک

بیادِ ثریّا سعیدی مرحومہ

ثریّا عندلیب سعیدی

۲ر فروری ۱۹۶۹ء کو یہاں دہلی میں میری جواں سال، تندرست اور خوبصورت لڑکی کپڑوں میں آگ لگ جانے سے اچانک جل کر مر گئی، میں روزانہ اُس کی قبر پر جاتا اور رو پیٹ کر ہلاک ہو کر آجاتا، خیال ہوا کہ خود بھی کمزور ہو بیمار ہوا اور اسی میں معاش کی فکر میں چلنا پھرنا بھی پڑتا ہے، یہ روز روز کی ہلاکت ٹھیک نہیں، مرنے والی کی مغفرت بھی تمہاری اِس روز کی آمد و رفت پر منحصر نہیں، پھر میں دس دن میں دو بار، ہفتے میں ایک بار جانے لگا، ایک دن پہنچا تو اُس کی قبر آس پاس کی دوسری قبروں میں کچھ ایسی مل جل گئی تھی کہ میں پہچان ہی نہ سکا، ہوا یہ کہ ایک پتھر دفن کے وقت اُس کے سرہانے قائم کر دیا تھا یہی اُس کی پہچان تھی، اِس مدت میں وہ پتھر کسی دوسری ضرورت سے کہیں اور منتقل کر دیا گیا۔ میں نے اپنی تاخیر آمد و رفت کی شرمندگی اور قبر کو نہ پہچاننے کے غم کو اِس شدت سے محسوس کیا کہ دیوانہ وار قبرستان کے محافظ کے پاس جاکر اُس سے کہا کہ مجھے میری لڑکی کی قبر نہیں مل رہی ہے کیا تم بتا سکتے ہو، اُس کا ذہن قبرستانی وہ میرے اضطراب و استفسار پر ہنس پڑا جیسے کہہ رہا ہو، تُو کیا اور تیری لڑکی کی قبر کیا، یہاں:

بس نامور بزیرِ زمیں دفن کردہ اند　　کز ہستیش بروئے زمیں بر نشاں نماند

مرحومہ کا بھائی محبوب سعیدی یونیورسٹی کی تعطیلات میں گھر آیا تو اُس نے مجھے لے جاکر قبر شناخت کرادی اور اُسے پختہ و نیم پختہ کچھ بنوا بھی دیا، لیکن اِس سے پہلے میں اپنے عالمِ حرمان و حُزن میں یہ شعر کہہ چکا تھا:

بسا ہُوا ہے کس انداز پر دیارِ اجل　　مکیں تو خاک ملے گا، یہاں مکاں نہ ملا

ابھی ملا ہے جو دو گز زمیں کے ذرّوں کو — کہیں زمیں پہ وہ انداز کہکشاں نہ ملا

مسافرانِ عدم کس طرف سے جاتے ہیں — کسی طرف بھی کوئی نقشِ کارواں نہ ملا

نہاں ہیں جس میں دُرِ اشکِ چشم و دل میرے — وہ ڈھیر خاک کا، وہ گنجِ شائگاں نہ ملا

بہارِ خُلد ہے جس قطعے میں یہیں ہوگا — مگر وہ قطعہ زمیں کا مجھے یہاں نہ ملا

اجل کے باغ میں ہیں پھول آرزوؤں کے — گُلِ مُراد مگر زیبِ گلستاں نہ ملا

جو پھول مثلِ گُلِ سر سبد نظر آتا — وہ پھول ہی مجھے پھولوں کے درمیاں نہ ملا

سدا بہار ہیں گلہائے داغِ دل جس کے — وہ روضۂ غمِ جاوید و جاوداں نہ ملا

جھُلس گئی تھی کلی اک جس آتشِ گُل سے — وہ آگ کیا مجھے اُس آگ کا دُھواں نہ ملا

کہیں تڑپ تو اُٹھے میرے پیار کے سجدے — مگر جبیں کو مری کوئی آستاں نہ ملا

ہر ایک لوح پر اک داستانِ مرگ ملی — کسی بھی لوح پہ عنوانِ داستاں نہ ملا

ہر آشیانہ ملا جس میں کوئی بلبل تھی — مگر اک اپنی ہی بُلبُل کا آشیاں نہ ملا

گیا تھا قلب تپاں، جانِ بے قرار لئے — سکونِ قلبِ تپان و قرارِ جاں نہ ملا

"ملا نہ گوہرِ مقصود" جب کہے گا کوئی — کہوں گا اِس کے سوا اُس سے کیا، کہ ہاں نہ ملا

تمام گورِ غریباں کی خاک چھان چکا — مجھے تو قبر کا تیری کہیں نشاں نہ ملا

خدا کرے مجھے زیرِ زمیں سکوں نہ ملے — تجھے سکون کبھی زیرِ آسماں نہ ملا

ملا ہے زیست کی کشتی کو موت کا ساحل
ترے سفینۂ ہستی کو بادباں نہ ملا

سوختہ جاں ثُریّا سعیدی

تو کیا مجھے اے روحِ رواں چھوڑ گئی ہے
کاہیدہ سے اک جسم کو جاں چھوڑ گئی ہے

ہر چیز طبیعت پہ گراں چھوڑ گئی ہے
اک غم ہے کہ شائستۂ جاں چھوڑ گئی ہے

اِس راہ میں حسرت ہے تو اُس راہ میں عبرت
ہر رہ میں جنازہ سا رواں چھوڑ گئی ہے

جیسے مری آنکھوں نے سُنا ہو کبھی تجھ کو
یوں اپنے تصوّر کا گُماں چھوڑ گئی ہے

سینے میں جو ہر سانس ہے ماتم کی اک آواز
تُو شاملِ انفاسِ فغاں چھوڑ گئی ہے

اِس طرح گئی پھیر کے تو مجھ سے نگاہیں
آنکھیں مری جانب نگراں چھوڑ گئی ہے

شعلوں سے گزر کر جو گئی ہے تو مجھے بھی
اے سوختہ جاں! شعلہ بجاں چھوڑ گئی ہے

آنسو ہیں بھڑکتے ہوئے پتھّر کے شرارے
کس آگ کا آنکھوں میں دُھواں چھوڑ گئی ہے

شعلہ سا نظر آتی ہے جس چیز کو دیکھوں
ہر چیز کو تُو شعلہ فشاں چھوڑ گئی ہے

سگرٹ جلاؤں تو بھڑک اٹھتی ہے وہ یاد
ماچس میں جو یاد اپنی نہاں چھوڑ گئی ہے

تُو خندہ بلب خود گئی، آنسو مگر اپنے | شاید مری آنکھوں سے رواں چھوڑ گئی ہے
افسردہ سی پھرتی ہے جو یوں بادِ بہاری | تو ہر روشِ گُل پہ خزاں چھوڑ گئی ہے
اے صبحِ چمن! تُو ہی نہیں صرف، یہاں تو | ہر صبحِ چمن شامِ خزاں چھوڑ گئی ہے
اُس سمت سے ہٹتی نہیں اب تک مری نظریں | جس سمت مجھے تُو نگراں چھوڑ گئی ہے
اب تک نظر آتی ہے اُسی سمت کو جاتے | جس سمت مجھے تُو نگراں چھوڑ گئی ہے
اُس سمت سے آتے ہوئے آتی ہے نظر تُو | جس سمت مجھے تُو نگراں چھوڑ گئی ہے
ہوتی نہیں اُس سمت جہت ہی کوئی قائم | جس سمت مجھے تُو نگراں چھوڑ گئی ہے
اُس سمت کبھی دیکھ ذرا خود بھی تو آکر | جس سمت مجھے تُو نگراں چھوڑ گئی ہے
اُس سمت، فضائیں ہیں جناتے ہی جنانے | جس سمت مجھے تُو نگراں چھوڑ گئی ہے
پہنچوں گا ترے پاس اُسی سمت کو چل کر | جس سمت مجھے تُو نگراں چھوڑ گئی ہے
اندازِ نظر ہیں بھی، باندازِ نفس بھی | اک سلسلۂ آہ و فغاں چھوڑ گئی ہے
دُنیا ہو، یہ نغمے ہوں، مگر میرے لئے تُو | ہر نغمے پہ نوحے کا گُماں چھوڑ گئی ہے
اب تو اگر آجائے تو شاید وہ بدل جائے | جاتے ہوئے اپنے جو سماں چھوڑ گئی ہے
یہ کوئی جگہ تھی کہ مجھے چھوڑ کے جاتی | تو خود بھی سمجھتی تھی، جہاں چھوڑ گئی ہے
چھوڑے کوئی دشمن بھی نہ دشمن کا جہاں ساتھ | اک باپ کو، بیٹی! تو وہاں چھوڑ گئی ہے
اجمال بھی اک قہر ہے تفصیل تو تفصیل | یہ کہتے بھی ڈرتا ہوں، کہاں چھوڑ گئی ہے

کیا کچھ نہ کہوں، آہ، مگر میری زباں کو
تو مانعِ اظہار و بیاں چھوڑ گئی ہے

آبشارِ اشک

بن گیا ہے مری اک سانس مرا ہر آنسو
زندگی آہ بھی جاتی ہے بن کر آنسو

اِس طرح عشق کی تقسیم ہوئی روزِ ازل
دل کی تقدیر غم، آنکھوں کا مقدّر آنسو

عشق کی جان کو دیتے ہیں دعائیں ہر وقت
دل مرا کھا کے غم، آنکھیں مری پی کر آنسو

ضبطِ گریہ سے جو آنکھوں میں کھٹک ہوتی ہے
خشک ہوتے ہیں تو ہو جاتے ہیں کنکر آنسو

بہہ چکے قلب و جگر جب تو یہ آنسو کیسے
کہیں آنکھیں تو نہ بہنے لگیں بن کر آنسو

خاک میں مل کے مرے اشک بھی مجھ کو نہ ملے
قہقہے کاٹتے ہیں لوگ تو بو کر آنسو

دیکھ لیں میرے سراپا کو مری آنکھوں سے
دیکھنا چاہیں جو اپنا کوئی پیکر آنسو

میں کبھی دل میں کبھی رُوح میں رکھ لیتا ہوں
وقت بے وقت کو آنکھوں سے چُھپا کر آنسو

رہ گئے ہوں نہ کہیں پھوٹ کے بہنے کے لیے
میری آنکھوں کی جگہ آبلہ بن کر آنسو

کاش آنکھوں میں کبھی آئیں جو رہ جاتے ہیں
بن کر آتش کدۂ دل میں سمندر آنسو۔

اشکِ شبنم سے ہے کیا عالمِ شادابیٔ حُسن — قہقہوں میں کوئی دیکھے تو سمو کر آنسو

جن کو رونا ہو وہ ہنس ہنس کے بھی رو لیتے ہیں — قہقہوں میں بھی بدل جاتے ہیں اکثر آنسو

جن سے اندازۂ کیفیّتِ غم ہو سکتا — آ سکے وہ نہ مری آنکھوں سے باہر آنسو

پرتوِ حُزن بھی خود جس کی لطافت پہ ہو بار — بن سکے غم کا وہ احساس تو کیونکر آنسو

قہقہے بن کے سمائے تھے جو ارماں دل میں — آج آنکھوں سے نکلتے ہیں وہ بن کر آنسو

چاندنی رات، چمیلی کے یہ پھولوں کا چمن — کس کی آنکھوں سے گرے کس کے کفن پر آنسو

ایک مہکا ہوا فردوس، مشامِ غم ہے — ہیں تری یاد کی خوشبو سے معطّر آنسو

چشمِ نابینا میں آ جائیں تو بینا ہو جائے — ہیں تصوّر سے ترے کتنے مُنوّر آنسو

بہہ کر آنکھوں سے جو پہنچیں یہ ترے مرقد تک — میری آنکھوں کو بھی لے جائیں بہا کر آنسو

اُبھرا آیا جو ترا پرتوِ رنگیں اِن میں — بن گئے پھول تری قبر پہ گر کر آنسو

اِن سے پہلے تری تُربت پہ نظر ڈالتی ہیں — میری آنکھوں سے نہ ہو جائیں مکدّر آنسو

یہ تو اک قبر کی ہیں خاک کے ذرّے بسمل
نہ ستارے ہیں فلک کے نہ یہ گوہر آنسو

میں ترے عشق کا اقرار کروں یا نہ کروں
اپنی ہستی کا پھر انکار کروں یا نہ کروں

یوں بھی تسکینِ دلِ زار کروں یا نہ کروں
خواب میں بھی ترا دیدار کروں یا نہ کروں

ہائے یہ وحشتِ دل، وائے یہ شوریدہ سری
گھر کو میں بے در و دیوار کروں یا نہ کروں

جان اس دل سے ہے بیزار، تو پھر کوئی کہے
دل کو اس جان سے بیزار کروں یا نہ کروں

وردِ لب نام ترا دل میں تری یاد کی آگ
ضبطِ انفاس شرر بار کروں یا نہ کروں

جزو کو دیکھ کے یاد آئے اگر کُل، تو قیاس
اک شرر کو کُرۂ نار کروں یا نہ کروں

نہ بھلا دے کہیں تجھ کو مری غمخواری میں
میں تری یاد کو غمخوار کروں یا نہ کروں

راس آئے جو ترا غم مجھے درماں بن کر
غم کو درمانِ دلِ زار کروں یا نہ کروں

جاگنے دے نہ جوانی کو کہیں موت کی نیند
صبحِ محشر تجھے بیدار کروں یا نہ کروں

گوہرِ اشک تری آنکھوں کے جب یاد آئیں
اپنی آنکھوں کو گہر بار کروں یا نہ کروں

زندگی تھی تری غمناک تری موت سے بھی
سوچتا ہوں کہ یہ اظہار کروں یا نہ کروں

میرے ہوتے تری یہ موت، مری موت ہوئی
چاک یہ پردۂ اسرار کروں یا نہ کروں

فطرتِ منتقمہ کو کروں کیوں کر اندھا
ذہنِ عالم کو تو ہموار کروں یا نہ کروں

زندگی مرگِ مسلسل ہو تو بسمل اک دن
سہل یہ مُردنِ دشوار کروں یا نہ کروں

شبِ برات

ہر اک کی قبر پر اِس رات اُس کے رشتے دار آئے
مگر میرے لیے بلّا! نہ تم سوئے مزار آئے

ملائک صف بہ صف آئے، قطار اندر قطار آئے
لیے ہمراہ اپنے رحمتِ پروردگار آئے

یہ میرا مقبرہ اِک جلوہ گاہِ طورِ ایمن تھا
نظر اِک کہکشاں، ذرّاتِ خاکِ رہگزار آئے

نہ آئے پھینکنے دو پھول بھی تم میری تربت پر
بنانے کو دُلہن قبروں کو لے کر لوگ ہار آئے

مری نظروں نے دیکھا سارے قبرستان میں تم کو
تصوّر ہی تصوّر میں نظر تم بار بار آئے

میں کہتی ہی رہی سب سے مرے بسمل، مرے بلّا!
اب آئے سوگوار آئے، اب آئے اشکبار آئے

وہ اپنے داغِ دل، داغِ جگر لائے، مرے غم کے
مرے اُجڑے چمن کے واسطے لے کر بہار آئے

تمہیں اِس رات آنا چاہیے تھا فاتحہ پڑھنے
نہ آنا تھا تمھیں لیکن نہ تم بیگانہ وار آئے

کسی نے پھول مجھ بیکس کی تربت پر جو ڈالے تھے
فرشتے لے کے میرے پاس اُن کو شرمسار آئے

ہوئی محسوس اپنی بیکسی اور کس مپرسی جب
مری آنکھوں میں آنسو آئے اور بے اختیار آئے

مگر پھر میں تمھارے راستے میں اُن کو ڈال آئی
کہ شاید اس طرح زیرِ قدم کوئی نہ خار آئے

ہوا سے خشک پتّے اُڑ کے جب مرقد پر آتے تھے
سمجھتی تھی کہ پروانے سرِ شمعِ مزار آئے

کہاں کی شمع، تربت پر اگر بتّی نہ تھی روشن
اندھیرے میں کوئی پروانہ کیوں کر جان ہار آئے

نہ سمجھے فرض ہیں کچھ اور بھی، تم نے تو یہ سمجھا
کہ سارے قرض اُتار آئے جو تربت میں اُتار آئے

لیا کس طرح دیکھو انتقامِ زیست ہم نے بھی
مَرے تو خیر ہم لیکن تمھیں بھی مر کے مار آئے

گذرتی ہے تمھاری کس طرح اب دیکھنا یہ ہے
چلو اچھی بڑی ہم تو وہاں اپنی گزار آئے

ہماری زندگی میں تو نہ آیا راس کچھ تم کو
ہمارے بعد جو کچھ ہو تمھیں وہ سازگار آئے

خدا جانے کہاں ہو تم، بُلانے کو تمھیں اِس وقت
فرشتے میں نے جو بھیجے تھے وہ گھر پر پُکار آئے

غزل

جو مرا خیال کبھی ہو کہ تجھے میں بھول جاؤں
تو مری مجال کبھی ہو کہ تجھے میں بھول جاؤں

کوئی دل بھلا سکا ہو اگر اپنی دھڑکنوں کو
تو کوئی مثال کبھی ہو کہ تجھے میں بھول جاؤں

یہ زمیں یہ آسماں کیا مرے بھولنے کو کم ہیں
یہ کوئی سوال کبھی ہو کہ تجھے میں بھول جاؤں

یہ زوالِ عقل بہتر کہ بھلا سکوں نہ تجھ کو
وہ اگر کمال کبھی ہو کہ تجھے میں بھول جاؤں

جو کبھی یہ حال کبھی ہو کہ میں آپ کو بھلا دوں
تو کبھی وہ حال کبھی ہو کہ تجھے میں بھول جاؤں

میں جہانِ شور و شر میں کبھی رہ سکوں نہ زندہ
اگر احتمال کبھی ہو کہ تجھے میں بھول جاؤں

تری یاد زخم ہے تو یہی زخم اور یہی دل
جو وہ اندمال کبھی ہو کہ تجھے میں بھول جاؤں

تری یاد ہجر ہے تو ترے ہجر میں مروں گا
وہ اگر وصال کبھی ہو کہ تجھے میں بھول جاؤں

جو یہ میری زندگی ہے کہ تجھے میں یاد رکھوں
تو وہ انتقال کبھی ہو کہ تجھے میں بھول جاؤں

مری موت بن کر آئے وہ خیال، جانِ بسمل
جو مجھے خیال کبھی ہو کہ تجھے میں بھول جاؤں

سالگرہ

جُدا ہوئے تجھے مجھ سے ہوا ہے آج اک سال　　مناؤں گا تری برسی بنامِ سالگرہ
سرشکِ غم سے چراغاں کروں گا بزمِ الم　　کریں گے دیدۂ تر اہتمامِ سالگرہ
طلوعِ چاکِ گریباں، غروبِ دیدہ و دل　　یہ صبح سالگرہ ہے، وہ شامِ سالگرہ
بہارِ خلد! تری یاد کرکے شالِ غم　　کروں گا غم سے معطّر مشامِ سالگرہ
میں اشکِ غم کو پیوں گا سمجھ کے بادۂ غم　　بنا ہے دیدۂ تر تیرا جامِ سالگرہ

اُسی فرشتے سے بھجوا دوں جان تحفے میں
جو لائے خلد سے تیرا سلامِ سالگرہ

موت

موت! اے موت! اے دشمنِ جاں　　اے فنا ساز و اے فنا ساماں
کر دیے تُو نے گھر کے گھر برباد　　محفلوں کی ہیں محفلیں ویراں
کب سے گلچینِ باغِ ہستی ہے　　نہ بھرا آج تک ترا داماں
اے چمن بند و باغبانِ فنا　　تیرے گلزار کی بہار، خزاں
تیری پھلواریاں، پھوار تری　　دلِ غمگین و دیدۂ گریاں
ہے حذاقت تری ہلاکت کار　　اے مسیحا و حاذقِ دَوراں
تیرے نسخے میں زہر، سر دارُو　　تیری صحت ہے دردِ بے درماں
تیرا دستِ شفا ہے دستِ فنا　　تیرا اعجاز ہے ضیاعِ جاں
موج، کشتی ہے، بادباں گرداب　　تیرے ساحل، تلاطم و طوفاں
کپکپاتے جگر، تڑپتے دل　　خلوتِ جبر میں تری رقصاں

محفلِ قہر میں تری، ناشاد — مُطربانِ نشاط، مرثیہ خواں

بزمِ بیداد کے تری، نغمات — آہ و فریاد و نالہ و افغاں

کتنے مہتاب و آفتابِ حیات — تیری شب ہائے تار میں غلطاں

اک جمودِ دوام تیرا دیار — نہ گُریزاں وہاں نہ کچھ گُزراں

نہ کوئی سال وسن نہ سمت وجہت — تیرا عالم ہے بے زماں ومکاں

قبر، مرقد، مزار، تُربت، گور — تیرے قدموں کے ہیں یہ سارے نشاں

قہقہے زلزلوں کے، زیرِ قدم — زیرِ لب، خندہ ہائے برقِ جہاں

شہسوارِ فنا! جلو میں ترے — نوحۂ جاں گزا و اشکِ رواں

ناتوانوں کے لاشہ ہائے سُبک — دوش پر تیرے کس قدر ہیں گراں

ہیں شکارِ زبوں، ضعیف و زار — تیرے فتراک میں جواں ہی جواں

ہو کے پامال، دیکھ حشر خرام — آسماں زیرِ خاک ہیں پنہاں

نہ سرِ رہگزار تجھ سے پناہ — نہ بُروجِ مُشَیّدہ میں اماں

موت! اے موت! او دشمنِ جاں

اے فنا ساز و اے فنا ساماں

رُباعیات

قطعات

مرشد نے دعا جو بہرِ سائل فرمائی نخوت وہ دعا میں اپنی شامل فرمائی
اللہ نے جبریل سے گھبرا کے کہا دیکھو تو یہ وحی کس نے نازل فرمائی

ہر شورشِ فسق عام کرنے والو ہر قبر پہ اژدہام کرنے والو
ساغر کی کھنک ہے سمعِ ایماں پہ گراں بابانگِ دہل حرام کرنے والو

صوفی نے کہا خستہ ہے درگاہ کا حال اے روحِ مزار! اک نگہِ فیضِ کمال
ملا نے کہا ہوتی نہ یہ حالتِ دیں گر روح کو ہو سکتی تصرّف کی مجال

خلوت میں مرا مشغلہ مے نوشی کا اسلام کے نقصان کا باعث ہے سوا
یا وقتِ جماعت سرِ بازار اکثر مسجد کے قریب آپ کا بیٹھا رہنا

ملتی ہے کوئی شوخ جب ان کو سرِ راہ محشر بہ قدم، سیم تن، آوارہ نگاہ
ملّا کو نظر آتا ہے اُس میں ابلیس صُوفی کو نظر آتا ہے اس میں اللہ

بوسیدگی کپڑوں کی نہ کرتی تھی حزیں
فاقوں میں بھی خوش رہتے تھے شاہنشۂ دیں
اِن باتوں کا جواب وعظ میں کرتی ہے بیاں
اُبھری ہوئی توند اور عبائے زریں

وہ اور ہے وہ گھر پہ لگانے کی ہے
یہ اور ہے یہ وعظ میں لانے کی ہے
دو عینکیں رکھتے ہیں جنابِ واعظ
اک دیکھنے کی ایک دکھانے کی ہے

مستغنیِ احکامِ شریعت ہو لوں
وابستۂ اوہامِ طریقت ہو لوں
چھوٹیں گے نہ اب حضرتِ مرشد کے قدم
بہتر ہے کہ اللہ سے رخصت ہو لوں

ہوتے ہیں مشائخ میں جو اکثر سالوس
افعال کے پاتے ہیں نتیجے معکوس
کھاتے ہیں مریدوں میں غذائیں صالح
ہو جاتی ہے معدوں میں ردی الکیموس

نبھ جائے گا محفوظِ معائب ہونا
راس آئے گا اللہ کا نائب ہونا
پیری نے جوانی کے گنہ ختم کیے
اے شیخ مُبارک تجھے تائب ہونا

بربادیِ اسلام الٰہی توبہ
اُس صبح کی یہ شام الٰہی توبہ
قرآں سے آغاز ہو قوالی کا
قرآن کا انجام الٰہی توبہ

باطن کا کسی کے راز کس طرح کھُلے
اِخفا کے طریقے بھی تو کوئی دیکھے
انسانیت و مذہب و ایثار و خلوص
ہیں روئے منافقت پہ کتنے پردے

ایمان کی ہر سانس میں ڈھل جاتا ہے جہل
ایقان کی رگ رگ میں مچل جاتا ہے جہل
ثابت نہیں کر سکتے اُسے جہلِ علوم
جب دین کی آغوش میں پل جاتا ہے جہل

وہ علم ہے اِک جہل عیاذاً باللہ
جِس علم سے ہو دین میں پیدا اکراہ
خود جہل بھی اپنے لئے سمجھے جسے عار
اس جہل کو دے سکتا ہے یہ علم پناہ

جب عقل کی کرتا نہیں تعمیل یہ جہل
کر سکتا ہے اَدیان کی تذلیل یہ جہل
پھر جہل کی ممکن نہیں رہتی اِصلاح
جب علم میں ہو جاتا ہے تبدیل یہ جہل

دِل اور زباں میں نہ ہو تفریق اے کاش
فعل اُن کے کریں قول کی تصدیق اے کاش
فرماتے ہیں شاعری کو جھوٹا جو بزرگ
سچ بولنے کی اُن کو ہو توفیق اے کاش

عشرت گہِ صد عید نظر آتا ہے
اِک قلبِ پُر اُمّید نظر آتا ہے
گر پڑتی ہے جب خاک کے ذرّوں پہ شراب
ہر ذرّے میں خورشید نظر آتا ہے

مخمور ہیں آثارِ خرابی اپنے
ہیں موئے بدن بھی تو شرابی اپنے
رہتا ہے کہیں جوہرِ رنگیں گھُٹ کر
قطرے ہیں پسینے کے گلابی اپنے

مُژدہ ہو جہنّم کے سزاواروں کو
اللہ کی رحمت کے پرستاروں کو
دوزخ کو تو میخوار پیئے جاتے ہیں
اَب کون جلائے گا گنہگاروں کو

بُنیادِ نشاط و عیش محکم کر لیں
میخانے کا پھر بلند پرچم کر لیں
وہ جھوم کے ساون کی اُٹھی پہلی گھٹا
برسات کی رُت کا خیر مقدم کر لیں

رُوداد جوانی کی مکمّل نہ ہوئی
مجمل ہی رہی بات مفصّل نہ ہوئی
کل کے لئے رکھتا ہے جوانی بسمل
نا عاقبت اندیش اگر کل نہ ہوئی

محروم ہے یہ دیدۂ نظّارہ جو
حالانکہ مری چشم تصوّر میں ہے تو
آنکھوں سے یہ قرب اور نگاہوں سے یہ بُعد
ہے گُل میں بھی اور گُل سے جدا بھی خوشبو

دیکھی نہیں جاتی تری تیکھی چتون
کس طرح اُٹھا سکتا ہوں جورِ دشمن
کانٹے کی کھٹک تو ہو گوارا کیوں کر
برداشت نہیں پھول کی پتّی کی چبھن

دل میں ہوئی تسکیں متمکّن کیوں کر
نبض متحرک ہوئی ساکن کیوں کر
ہو ایک جُدا آپ سے ممکن ہی نہیں
پھر اپنی جدائی ہوئی ممکن کیوں کر

پتّھر ہی نہ صرف گل رہے ہیں یارب
آئینے بھی کچھ پگھل رہے ہیں یارب
دوزخ میں ہزاروں جلنے والے کم بخت
اوروں کے گنہ میں جل رہے ہیں یارب

ہر چیز جنہیں حسبِ تمنّا دی تھی
ہر چیز جنہیں اُن کی ہی سمجھا دی تھی
جنّت کے کھلونوں سے جہنّم بھر جائے
یہ بھی اُنہیں دیدے جنہیں دنیا دی تھی

پاکیزگیٔ رفعتِ افکار نہ ہو — یا مصلحت اندیشیٔ کردار نہ ہو
انسان تو اللہ کا شہ کار سہی — اللہ خود انسان کا شہ کار نہ ہو

آثارِ حیات سے بھی مر جاتا ہوں — سچ جانیے میں جی سے گزر جاتا ہوں
اتنی کڑکی ہے غم کی بجلی دِل پر — آواز سے قہقہے کی ڈر جاتا ہوں

ہر بزم کے افسانے نہیں ہیں ہم لوگ — ہر شمع کے پروانے نہیں ہیں ہم لوگ
جس سے نہ ملے دل نہیں ملتے اُس سے — ہر چند کہ بیگانے نہیں ہیں ہم لوگ

اے مدّعیِ درگزر و عفوِ گُناہ — ابلیس میں کیوں کر ہوں صفاتِ اللہ
کینے سے ہو شاید ترا دِل پاک اُس وقت — جب زہر سے خالی ہو سرِ مارِ سیاہ

شیطان سے مانگتا ہے انسان پناہ — اِنسان سے شیطان کے دِل میں اِکراہ
اِک دوسرے کو دیکھتے ہی کہتے ہیں — لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ

اپنوں سے تجھے بَیر خدا تجھ سے بچائے — سو غیروں کے اِک غیر، خدا تجھ سے بچائے
مُحسن ترے بچ سکے نہ تیری زَد سے — او منتقمِ خیر، خدا تجھ سے بچائے

اک رات سُہانی نہیں دیکھی جاتی — جذبات فشانی نہیں دیکھی جاتی
سو عیبوں کا اِک عیب ہے یہ پیری میں — اَوروں کی جوانی نہیں دیکھی جاتی

مستِ مئے پندارکسل سے ہشیار   پاداشِ عمل ، ردِّ عمل سے ہشیار
اَوروں کی طرف پھینکنے والے پتھر   اپنے بھی ذرا شیش محل سے ہشیار

یُوں غُصّہ دِلاوروں کو گرماتا ہے   جس طرح کوئی شیر بپھر جاتا ہے
بُزدل کا مگر جذبۂ غیرت ، جیسے   پانی میں نظر آگ کا عکس آتا ہے

یہ اَمن واماں کی رہگذر ہے بسمل   وہ رہگزرِ خوف وخطر ہے بسمل
تُم ایک دوراہے پہ کھڑے ہو اِس وقت   دُنیا ہے اِدھر، دین اُدھر ہے بسمل

غفلت میں کچھ ایسے پھنس رہے ہیں ہم لوگ   ماتم میں بھی اپنے ہنس رہے ہیں ہم لوگ
ہے جِس کے دہانے سے پلٹنا دُشوار   اُس غار کی تہہ میں دھنس رہے ہیں ہم لوگ

گر جنگ پہ مائل ہے تو میدان میں آ   تلوار کا حامل ہے تو میدان میں آ
بیٹھا ہے کہاں کونے میں چھپ کر نامرد   مردوں کا مقابل ہے تو میدان میں آ

اجمال کو کرتی ہے مفصّل فطرت   انساں کو بناتی ہے مکمّل فطرت
انسان کی فطرت کو ودیعت ہے گناہ   انسان کا ہے مذہبِ اوّل فطرت

دامانِ زمیں چاک نظر آتے ہیں　　ڈوبے ہوئے افلاک نظر آتے ہیں
بیدرد مگر مچھوں کے آنسو بسملؔ　　غمناک سے غمناک نظر آتے ہیں

اس زہد سے خود دین کو ہے بیزاری　　جس زہد کے پردے میں ہو عصیاں کاری
کر دیتا ہے جو دین کی صورت کو مسخ　　اس زہد سے اچھی ہے مری میخواری

جذبے سے جوانی کو بھی یہ قرب نہیں　　دریا سے روانی کو بھی یہ قرب نہیں
اللہ رے مرے دل سے تمھارا یہ قرب　　لفظوں سے معانی کو بھی یہ قرب نہیں

روشن جو ہوئی شمعِ کلامِ غالبؔ　　اس شمع سے روشن ہوا نامِ غالبؔ
بسملؔ افقِ دہر پہ آتا ہے نظر　　خورشیدِ سحر، کوکبِ شامِ غالبؔ

بے مرحلہ و بے خبرِ منزلِ عشق　　اک شوقِ مسلسل ہے سرِ منزلِ عشق
کیا حسن کو ہو عشق کی منزل کا پتہ　　خود حسن بھی ہے رہگذرِ منزلِ عشق

رہبر ہو تو منزل کی خبر لو پہلے　　مانجھی ہو تو ساحل کی خبر لو پہلے
کیا تم کو کسی کی خلوتوں سے سروکار　　تم اپنی تو محفل کی خبر لو پہلے

وحشت سے بلا ہزار درجے بہتر　　ہستی سے فنا ہزار درجے بہتر
جل جل کے جئیں تو کیوں نہ مر کر جل جائیں　　چنتا سے چتا ہزار درجے بہتر

جس شب میں نشاط و عیش شانے تھپکیں
جس شب میں نظاروں کی نہ پلکیں جھپکیں
وہ شب جو تمام قہقہوں میں گزرے
اُس شب کو نچوڑ دو تو آنسو ٹپکیں

اُڑ جائے گا پھولوں سے یہ رنگ اور یہ بُو
بن جائیں گے یہ قہقہے اک دن آنسو
سرمایۂ عشرت ہے متاعِ ماتم
ہے بے خبرِ خزاں، بہاریں تو

ہر پھول کی آنکھ میں ہے اشکِ شبنم
شامل ہے یہاں ہر اک خوشی میں اک غم
ہر شامِ طرب زا میں ہے صبحِ ماتم
ہر صبحِ مسرت میں ہے اِک شامِ الم

دل کا مرے، اندوہ سے ڈِھنا دیکھو
اس شدّتِ غم کو دل پہ سہنا دیکھو
تم دیکھ نہیں سکتے جو دل کا ڈِھنا
آنکھوں سے ان آنسوؤں کا بہنا دیکھو

ساغر مجھے زہراب کے پینے ہوتے
دل اور جگر کے چاک سینے ہوتے
آہیں مرے دل سے تھیں کرنی نہ تھیں سلب
آنسو مری آنکھوں سے نہ چھینے ہوتے

آہوں پہ پڑے ہوئے ہیں تالے بسملؔ
پہنے ہوئے ہتھکڑی ہیں نالے بسملؔ
جکڑے ہیں جو بیڑیوں میں آنسو میرے
کوئی انھیں زنداں سے نکالے بسملؔ

ملتے ہی بنا لیتے ہیں صورت محسنؔ
رکھتے ہیں نہ صاحب نہ سلامت محسنؔ
بدتر ہے وہ احسان فراموشی سے
لیتے ہیں جو احسان کی قیمت محسنؔ

کیوں سوزِ دل اشکوں میں نہ ڈھالے بسمل کیوں دل کی لگی کو نہ بجھالے بسمل
دل پر جو پڑے ہیں چھالے، آنسو بن کر آنکھوں سے وہ بہہ رہے ہیں چھالے بسمل

تہذیب اُسے ناگوار، مذہب اُسے شاق کچھ ذوق شعوری نہ تمیزی ہے مذاق
کج خلقی و بدروی یہ دانستہ نہیں دولت کا مزاج ہے خلافِ اخلاق

اِفلاس

جب نہ ہوتا اس کے تن پر چیتھڑا بیوگی میں پیٹتی سر ماںتا
دو برس کا بچّہ اِتنا ہوشیار عید سے اک روز پہلے مر گیا

مسوری

ہر سمت ذوقِ عشق کی اک جلوہ گاہ ہے ہر مرکزِ نگاہ بہشتِ نگاہ ہے
کس درجہ یہ فضائیں ہیں جذبات آفریں ان میں کوئی گناہ نہ کرنا گناہ ہے

ہَردُوار

پہلی کرن بہارِ سرِ کوہ سار سے پڑتی ہے رنگ و کیف کے نصفُ النہار سے
جس صُبح سے ملی ہیں بنارس کو شہرتیں بسمل، طلوع ہوتی ہے وہ ہردُوار سے

شِکست

ایک مندر میں جب اک بڑا بت گرا کان اہلِ حرم کے کھڑے ہو گئے
حادثے کا مگر یہ نتیجہ ہوا جتنے چھوٹے تھے بُت کُچھ بڑے ہو گئے

رنگا رنگ

ہر ایک راہ میں یوں ان کو عمر بھر دیکھا ۔۔۔ قدم قدم پہ ٹھہر کر اِدھر اُدھر دیکھا
دکھا سکیں گی نہ وہ سو قیامتیں بسمل ۔۔۔ جو حشر میں نے ثریا کی قبر پر دیکھا

تری اجل سے ہوا اعتبارِ حشر مجھے ۔۔۔ اک اعتبار ہی کیا اب تو انتظار بھی ہے

اپنی معراج پہ ہے آج محبت اپنی ۔۔۔ قبرِ دشمن کی نظر آتی ہے تربت اپنی
زنگ آئینے میں جس طرح نظر آتا ہے ۔۔۔ ان کی صورت میں نظر آتی ہے صورت اپنی

احساسِ غم سے بھی اب محروم ہو گیا ہوں ۔۔۔ حد سے زیادہ شاید مغموم ہو گیا ہوں

خلشِ خار سے نظروں کو بچانے والے ۔۔۔ کل اِن آنکھوں میں نہ کھٹکے گُلِ تر کی صورت
کر گئے وہ مری آنکھوں کو نظر سے محروم ۔۔۔ میری آنکھوں میں جو رہتے تھے نظر کی صورت
اب کوئی پھول نہیں میرے چمن میں شاداب ۔۔۔ داغِ دل بھی ہے وہی زخمِ جگر کی صورت

پھر زلزلۂ اجل کا جُنبش نہ دے سکا ہے — بُنیادِ غم خوشی نے جب اُستوار کی ہے

یا الٰہی کیا یہی بس حاصلِ فریاد ہیں — یہ جو دو آنسو پڑے ہیں دامنِ فریاد میں

مچلنے دے اگر جذباتِ آزادی مچلتے ہیں — قفس کو آشیاں کے سامنے صیّاد رہنے دے

میری تقدیر کہ بدلیں تری نظریں مجھ سے — تیری نظروں سے تو تقدیر بدل جاتی ہے
زندگی بھر مجھے اُس راہ میں چلتے گزری — مَوت جس راہ سے کترا کے نکل جاتی ہے

نظر میں جس کی وہ حسنِ کرشمہ ساز رہا — رہی نہ کوئی حقیقت نہ کچھ مجاز رہا
گزُر گئی ہے مِری اُن کی مُدّتوں یُوں بھی — نیاز و ناز میں کچُھ بھی نہ امتیاز رہا

سازِ دل میں کہیں بے زخمہ صدا ہوتی ہے — میری آواز میں آوازِ خدا ہوتی ہے

ہم ان کی جستجو کو سعیٔ لاحاصل سمجھتے ہیں — جو ہر نقشِ قدم کو جادۂ منزل سمجھتے ہیں
نہ سمجھیں کیوں کسی کے دردِ دل کو دردِ دل اپنا — کہ ہم اوروں کے دل کو بھی خود اپنا دل سمجھتے ہیں
جو گزری تجھ پہ اے مظلوم وہ اس پر بھی گزرے گی — ترے ماضی کو ہم ظالم کا مستقبل سمجھتے ہیں
انھیں سے وسعتِ انسانیت محدود ہوتی ہے — زمیں کی سرحدوں کو حدِ فاصل سمجھتے ہیں

جہنّم فتنہ سازی ہے بہشت افسانہ سازی ہے　　ترے ہوتے ہوئے کس کو مجالِ پاک بازی ہے

کس قدر تم سے محبت ہے مجھے　　اِس کی شاہد ہیں مِری تنہائیاں

گئے وہ دن کہ جب سجدے مرے ٹھکرائے جاتے تھے　　اُٹھا کر گھر میں رکھ لیں اَب وہ سنگِ آستاں اپنا

مستیاں تو چشمِ ساقی سے چھلک کر رہ گئیں　　آ گیا کم بخت میخانوں پر الزامِ شراب

اُن کی صورت کا تصوّر ہے اب اتنا مُبہَم　　جیسے دیکھا نہ ہو آنکھوں نے سُنا ہو اُن کو
عُذرِ معصومیتِ حُسن پر اللہ کرے　　حشر میں میرے گناہوں کی سزا ہو اُن کو

مشعل بَدوش شمع کی لَو دیکھتا ہوں میں　　ذرّے میں آفتاب کی ضَو دیکھتا ہوں میں
اُس اشک میں جو تا بہ مژہ بھی نہ آ سکے　　اک سَیلِ بے پناہ کی رَو دیکھتا ہوں میں

بیاباں ہوا ہوگا کوئی گُلستاں　　گُلستاں ہی اکثر بیاباں ہوئے ہیں
ابھی میری جانب سے کچھ بُعد سا ہے　　ابھی وہ قریبِ رگِ جاں ہوئے ہیں
بہاریں تبسّم کی پرچھائیاں ہیں　　وہی مُسکرا کر گُل افشاں ہوئے ہیں

ہائے وہ دو نامرادِ زیست جن کے درمیاں　　زندگی نے موت کی دُوری کو حائل کر دیا

اُن کے تبسّموں نے تو مجھ کو بُھلا دیا　　اب شاید آنسوؤں کو کبھی یاد آسکوں

حجابِ لطف و کرم میں ستم نکلتا ہے　　ہر اک لباسِ مسرت میں غم نکلتا ہے
نکلتا حوصلۂ شوق بن کے ارماں کیا　　یہ جان بن کے بھی نکلے تو کم نکلتا ہے
مفارقت کے غموں سے یہ حال ہے بسمل　　کہ آہ لب سے جُدا ہو تو دم نکلتا ہے

بہت شاد ہوتی ہے اب جب طبیعت　　تو کچھ دیر رونے کو جی چاہتا ہے

میں کیا کروں نیاز ہی مُجھ کو پسند ہے　　حالانکہ آستانے سے سجدہ بلند ہے
اِن بے نیازیوں پہ کسے آئے گا یقیں　　کس سے کہوں کہ حسن تمنّا پسند ہے

کس قیامت کی رات گزری ہے　　قبر میں جیسے لاش اُتری ہے

ہزاروں جامۂ ہستی کیے ہیں زیبِ تن بسمل　　مگر کمبخت اِس خنجر کی عریانی نہیں جاتی

ملک الموت کا دربان سے پہنچا جو سلام　　کہہ دیا میں نے، یہ کہہ دے کہ، دُعا کہتے ہیں

کفن بھی لاش کو جس کی نہ ہو سکا تھا نصیب　　اب اُس کی قبر پہ چادر چڑھائی جاتی ہے

کسی کی جدّتِ ظُلم آفرینی کا تصرف ہے　　ذرا سا ہوش بھی کم بخت دیوانے میں رکھ دینا

اپنا اندازِ پذیرائی مجھے سمجھا دے
اس سے پہلے کہ ترے در کو جبیں ٹھکرا دے

مطمئن کوئی حرم پر کوئی بت خانے پر
جس کو جو کچھ نگہِ ناز تری سمجھا دے

تبصرے ہیں مرے انجامِ وفا پر منظور
تو بھی اپنی نگہِ ناز سے کچھ فرما دے

یہ زمانہ ہے زمانے میں ہوں میں بھی تم بھی
نہیں معلوم یہ کس وقت کسے ٹھکرا دے

میرے ہی لئے پھر گئی ہیں سب وہ نظریں
لیکن مری جانب تو نظر پھر بھی نہیں ہے

اب ہاتھ مل رہا ہوں میں وہ دن گزار کے
حاصل تھے ابتدا میں جو اک اعتبار کے

ہر صاحبِ نظر سے جدا ہے معاملہ
پردے پڑے ہوئے ہیں وہاں اعتبار کے

میکدے میں ہے اگر ایمان بھی تو کفر ہے
خانقاہوں میں مگر ہر کفر ایماں ہوگیا

نشاں ہیں کتنی جبینوں کے آستاں پہ ترے
مری جبیں پہ کسی آستاں کا داغ نہیں

رہیں گواہ ستارے ترے شبستاں کے
کہ میری راتوں میں روشن کوئی چراغ نہیں

اندازِ جنوں عشق کے اب جا نہیں سکتے
تم بھی دلِ بیتاب کو سمجھا نہیں سکتے

اللہ کرے دل سے یہ احساس بھی مٹ جائے
شکوہ تو زباں پر ترا ہم لا نہیں سکتے

بھیس بدلے خوشی کا رہتے ہیں
کیسی آفت غموں نے ڈھائی ہے

اس کی بنیاد میں خوشی نکلی
جو عمارت غموں نے ڈھائی ہے

رہ رہ کے دِل سے کان میں آتی ہے اک صدا — جیسے پکارتا ہو کوئی دُور سے مجھے

ہماری مرگِ نومیدی سلامت — جئیں گے ہم کسی اُمّید پر کیا
جوابِ حُسنِ روز افزوں اگر ہے — محبّت ہے محبّت بھی مگر کیا

اَب نہ کعبے میں ہے ایماں اور نہ بُت خانے میں کُفر — میکدے میں ہے مگر گردش میں پیمانہ ہنوز

نظارۂ جمالِ سراپا کیے ہوئے — مُدّت ہوئی نگاہ کو سجدہ کیے ہوئے
اے مرگِ عشق آ کہ میں کب سے ہوں منتظر — ہر ناگوارِ زیست گوارا کیے ہوئے

مِل گئی ہے خاک میں بسمل کی زندگی — کیا زندگی تھی خاک، مگر زندگی تو تھی

قہقہوں کی گونج میں خاموش آنسو بھی تو ہیں — عشرتوں کی کروٹوں میں غم کے پہلو بھی تو ہیں

تُمہاری جیسی شباہت کو ڈھونڈتا تھا دِل — تمہاری شکل نہ دیکھی تھی جس زمانے میں

زِندگی اُن کے لئے قہر و قیامت ہو جائے — احمقوں کو اگر احساسِ حماقت ہو جائے

مجھے سَو رنگ سے مارا ہے اُن کی بیوفائی نے — کسی سُرخی سے اس کو میرے افسانے میں رکھ دینا

نشیمن تو چمن میں پھر بنالوں گا مگر بجلی — جہاں اک بار گرتی ہے وہاں سو بار گرتی ہے
نزاکت غم کدوں کی عشق کے بسمل معاذاللہ — کہ وزنِ سایۂ رہگیر سے دیوار گرتی ہے

مظہرِ ہر جلوۂ جانانہ ہے — کعبۂ دیر و حرم میخانہ ہے
کتنا بیگانہ ترا دیوانہ ہے — کوئی سمجھے تجھ سے بھی بیگانہ ہے
گردِ شمعِ بُت کدہ ہے پھر ہجوم — پھر چراغِ کعبہ بے پروانہ ہے

تم سے دُنیا کو اگر دین بنایا نہ گیا — واعظو! دین کو دُنیا نہ بنایا ہوتا

اُن کی نظریں بدل گئیں ورنہ — یوں زمانہ بدل نہیں سکتا
آگیا ہوں وہاں سے گھبرا کر — اب کہیں دل بہل نہیں سکتا

محبت اپنی شدت میں جنوں ہی کیوں نہ ہو جائے — تمہارے حُسن کے لائق محبت ہو نہیں سکتی
محبت جھولیاں اپنے گلے میں ڈال سکتی ہے — مگر وابستۂ دامانِ دولت ہو نہیں سکتی

ہنسنے میں یوں نمی تری آنکھوں میں آگئی — شبنم سے بھیگ جاتے ہیں جیسے چمن کے پھول
جس طرح شاخِ گل پہ ہوں رنگین تتلیاں — اِس طرح تیرے جسم پہ ہیں پیرہن کے پھول
نکلی نہیں ہے شیشۂ بلور سے شراب — دامن سے چاندنی کے یہ نکلے ہیں چھن کے پھول
دل میں چبھن سی ہوتی ہے آتے ہیں جب وہ یاد — غربت میں خار بن گئے بسمل وطن کے پھول

محبت جب سُلانے لگتی ہے فرقت کی راتوں میں
دلوں میں جاگنے لگتی ہیں روحیں سونے والوں کی

تیرے لئے جو آنسو آنکھوں سے بہہ رہے ہیں
آنسو نہیں یہ میری آنکھوں کے قہقہے ہیں

مدّعا کہہ کے بھی باتوں میں لگائے رکھوں
ورنہ سوچیں گے خدا جانے وہ کیا کیا دل میں

یوں کبھی ان کے تصوّر سے اچٹتی ہے نظر
جیسے اس وقت کوئی دیکھ رہا ہو اُن کو

پھر گئی کچھ اس طرح مجھ سے زمانے کی نگاہ
اُن کی برگشتہ نگاہی کو بھی پیار آ ہی گیا

جان اِس بے تعلّقی پر بھی
بر بنائے تعلّقات گئی
اُف مُسلسل یہ تیرگیِ لحد
نہیں معلوم کتنی رات گئی

کبھی فردوسِ چشمِ شوق بھی دیکھیں گے ہم تجھ کو
ابھی ہے عیدِ نظّارہ ترا دیدار ہو جانا
اَب آنسو بھی تری تصویر کا آئینہ ہوتے ہیں
کبھی آنکھوں کو مشکل تھا ترا دیدار ہو جانا

زندگی ضبطِ مَصائب ہے بقدرِ برداشت
موت ہے کثرتِ اندوہ سے گھبرا جانا
یوں تو یاد آنے ہی رہتے ہیں وہ اکثر لیکن
قہر ہوتا ہے کسی بات پہ یاد آ جانا

یا تو ابھی دُنیا نے خدا کو نہیں جانا
یا یہ ہے کہ دُنیا کا خُدا کوئی نہیں ہے

چمن ہزار بہ رعنائی بہار رہا   تمہارا حُسن تمہارا شباب ہو نہ سکا

اے بے کمال! تیرا زمانہ خلاف ہے   کس کس کی موت کا تجھے ارمان آئے گا
بسملؔ عجیب رنگ ہے اُس بزمِ ناز کا   جو جائے گا وہاں وہ پشیمان آئے گا

وفا کر کے میں بھی پشیماں ہوا ہوں   جفا کر کے تُو بھی پشیمان ہوگا
وہاں تک محبّت نباہوں گا تم سے   جہاں تک محبّت کا امکان ہوگا

چشمِ نظّارہ طلب رہ گئی آخر تھک کر   نظر آتے ہی گئے وہ اُنہیں جتنا دیکھا
عشرتِ ہستی موہوم کہوں کیا بسملؔ   چشمِ بیدار نے اِک خواب تمنّا دیکھا

جو ہوئی تھیں وجہِ ترکِ رسم و راہ   اُن جفاؤں کو بھی اب روتے ہیں ہم

بے ہوش کر کے ہوش میں لانا بھی سیکھئے   یہ کیا کہ اِک غریب کو بے ہوش کر دیا

کوئی بے تمنّا نہیں ہے پریشاں   تمنّا سے ساری پریشانیاں ہیں
وفائیں نہیں اب ہماری وفائیں   یہ ناکامیوں کی پشیمانیاں ہیں

معاذ اللہ اندازِ ستم کافر حسینوں کے   جفائیں چھوڑ کر جب یہ وفا سے کام لیتے ہیں
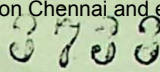
جاتی ہیں کوئی عشق کی چتون سے نخوتیں — اکثر جبینِ حُسن پہ بل آکے رہ گئے
کانٹے تو خشک ہو کے کھٹکتے ہیں اور بھی — وہ پھول تھے جو باغ میں مرجھا کے رہ گئے
معراجِ زندگیٔ محبّت کِسے نصیب — اکثر تو اپنی جان سے بھی جا کے رہ گئے

محبّت ساتھ دیتی ہے جہاں تک اپنے معنے کا — اَب اُس سے ماورا کچھ میری حالت ہوتی جاتی ہے
محبّت باوجودِ رشک توہینِ محبّت ہے — مگر شاید محبّت اَب محبّت ہوتی جاتی ہے
محبّت اِصطلاحِ عام ہو کر رہ گئی بسمل — زبانِ خاص کو اب اس سے نفرت ہوتی جاتی ہے

جس شخص کی بسمل سے مُلاقات ہوئی ہے — وُہ شخص محبّت کے پیمبر سے ملا ہے

کلمہ گو کہیں پھِرتے ہیں زباں سے اپنی — آج تک نام وُہی وردِ زباں ہے کہ جو تھا

میسّر جس زمیں کو ہے تمہارا آستاں ہونا — مُقدّر ہو چکا ہے اس زمیں کا آسماں ہونا
مِری بالیں پہ مرگِ عشق یہ کہتی ہوئی آئی — مُبارک عمرِ عرفانی کو حیاتِ جاوداں ہونا

ہے کائنات جس میں لیکن نہ جس میں تُو ہے — کوتاہ کِس قدر وہ دامانِ آرزو ہے
اللہ رے اُن کا حُسنِ عالم فریب بسمل — ہر حلقۂ نظر اِک آغوشِ آرزو ہے

ہائے وہ دن کہ روز مرتے تھے — آج لالے پڑے ہیں جینے کے

دوزخ گُناہِ شوق کی پاداش ہے اگر ذوقِ وصال خُلد کے بدلے گراں نہیں

نگاہوں میں چلتے ہیں سب کام اُن کے بہت سخت جن کی نگہبانیاں ہیں

نہ آسکی ہے جنہیں راس زندگی میری خدا کرے کہ اُنہیں میری موت راس آئے

دے کر نگاہِ شوق کو تسکینِ اضطراب اے چشمِ ناز' اب وہ اشارے کہاں گئے
جن کے تصوّرات بہشتِ خیال ہیں وہ جنّتِ نگاہ نظارے کہاں گئے
دریائے بے کنار تو ہوتا نہیں کوئی دریائے عشق تیرے کنارے کہاں گئے
اِن آنسوؤں سے اب تو یہ آنکھیں ہیں آبلہ شبنم کی طرح تھے جو شرارے کہاں گئے
قسمت مری جو بن کے چمکتے تھے رات بھر
اب آسمان سے وہ ستارے کہاں گئے

خوشا یہ عشق کہ پروانہ جانتا بھی نہیں کہ شمع گور ہے کیا، شمع انجمن کیا ہے
ہزار انجمنیں دل میں رقص کرتی ہیں نصیب خلوتِ دل ہو تو انجمن کیا ہے
وہ دن قریب ہیں دیوانۂ وطن کہ زمیں بھلا چکے گی تجھے بھی ترا وطن کیا ہے

اب تک بھی خاکِ راہ ہوں تیرے لیے مگر
اندیشہ مندِ جنبشِ داماں نہیں ہوں میں

جو ہم وابستۂ گیسو نہ ہوتے رہینِ جنبشِ ابرو نہ ہوتے
یہ آنکھیں پھر مرے کس کام آتیں ان آنکھوں میں اگر آنسو نہ ہوتے
اگر معصومیت شامل نہ ہوتی تری باتوں میں یہ پہلو نہ ہوتے

حرم سے دَیر کی جانب چلا ہوں اس توقع پر کہ شاید کچھ مروّت ہو کسی پتھر کی آنکھوں میں
نگاہِ قہر سے دیکھا تو رحمت کے اشارے پر ہم آنکھیں ڈال دیں گے داورِ محشر کی آنکھوں میں
ہوئے ہو سوکھ کر کانٹا تو بسملؔ جاؤ صحرا کو
کھٹکتے کیوں رہو دن رات سارے گھر کی آنکھوں میں

مانوس تھی جس زلف کے خم سے مری قسمت اس زلف کو بیگانۂ خم دیکھ رہا ہوں
وہ ظلم کے انداز سے ممکن ہی نہیں تھا جو ظلم بہ اندازِ کرم دیکھ رہا ہوں
اغیار کی آنکھوں کو میسّر ہیں بسملؔ
احباب کی نظروں میں جو رم دیکھ رہا ہوں

ناکام یہ سمجھ کے بھی ہر کام میں رہے وہ کام کون سا ہے جو انساں نہ کر سکے
ہو میزبانِ شامِ غمِ دہر، الاماں
بسملؔ جو صبحِ عید کو مہماں نہ کر سکے

آشیاں ہے مرا اُس کنجِ چمن میں بسملؔ
کہ خزاں آتی ہے جس میں نہ بہار آتی ہے

عشرتِ دنیا مرا کیا ساتھ دیتی عمر
یہ ترا غم تھا کہ جو دابستۂ جاں ہوگیا
بسمل اب اس منظرِ ہستی میں دلچسپی کہاں
دل پریشاں ہوگیا، عالم پریشاں ہوگیا

حق ہو اور تلخ نہ معلوم ہو اللہ اللہ — اُف ری شیرینیٔ گفتار رسولِ عربیؐ

ہزار حسنِ عبادت گناہ سے پہلے — اور ایک لطفِ عبادت، مگر گناہ کے بعد
مرے نصیب کی برگشتگی سہی، لیکن — پھرا ہے مجھ سے زمانہ تری نگاہ کے بعد

حرم اور دیر دونوں نظر آرہے ہیں دیر ال — نہ وہاں خدا نمائی، نہ یہاں صنم نمائی

بسمل جلا کے شمعِ تمنا تمام دن — بیٹھا ہوا ہوں رات اندھیری گزارنے

میرے سجود شوق میں رنگِ قبول آئے کیا — جب ترا سنگِ آستاں قابلِ بندگی نہ ہو

دیکھ کر گل گشت اک مستِ خرامِ ناز کی — ساغرِ گلرنگ میں کیا موجِ صہبا دیکھئے
قدِ آدم ہو کے جیسے رہ گیا ہو آفتاب
اک سراپا حسن کا حسنِ سراپا دیکھئے

رک کر بڑھا تھا راہِ طلب میں جو اک قدم　　منزل تک اس قدم کا اثر دیکھتے رہے

قبولِ اعتبارِ حسن اگر ہو جائے تو بسمل　　محبّت ایک وعدہ ہے، تمنا ایک پیماں ہے

توقعات نے یوں زندگی گزروا دی　　کہ جیسے آج تمنّا بر آئی جاتی ہے

ہے وہی اس کی منزلِ مقصود　　جو جہاں تھک کے چور ہو جائے
کامیابی کی گر اُمید رہے　　کامیابی ضرور ہو جائے
لذتِ جستجو یہ کہتی ہے
منزلِ شوق دور ہو جائے

یہ سُنا جاتا ہے بسملؔ کے لیے　　اک ولی با مشربِ رندانہ ہے

غم نہیں نازِ حسن ہے، حسن کے ناز اُٹھائے جا　　اے دلِ مبتلائے غم، غم میں بھی مسکرائے جا
حسن سے بڑھ کے بدگماں، عشق ہے اپنے آپ سے　　میں ابھی مطمئن نہیں، تو مجھے آزمائے جا

ہوگیا جذب اس میں جب سے میرا ذوقِ بندگی　　تیرا سنگِ آستاں سجدوں کے قابل ہوگیا
اللہ اللہ آبرو تیرے جنونِ عشق کی　　بسملؔ اب مستغنیٔ آدابِ محفل ہوگیا

حریمِ ناز کی اللہ رے رفعتیں بسملؔ　　خیال میں بھی کوئی باریاب ہو نہ سکا

بسمل ازل سے حسن نہیں آشنائے عشق　　موسیٰ کے ساتھ برقِ تجلی نے کیا کیا؟

اے چشم التفات تجھے جانتا ہوں میں　　اب اس فریب میں کوئی انجان آئے گا

آکے دنیا میں انقلاب کوئی
دل کی دنیا بدل نہیں سکتا

کرم کی توقع تو کیا تم سے ہوگی
ستم بھی کروگے تو احسان ہوگا

دنیا سے مری یاد بھلائی نہ جائے گی
یہ کیا کیا کہ تم نے فراموش کر دیا

بے کسوں کا کون ہے پُرسانِ حال　　کون پوچھے ہم سے کیوں روتے ہیں ہم
گر نہیں تو جان سے بڑھ کر عزیز　　جان کیوں تیرے لیے کھوتے ہیں ہم
بسمل اٹھ جائیں گے صبحِ حشر کو
اب تو چادر تان کر سوتے ہیں ہم

نہ پوچھو زندگانی غفلتوں میں کھونے والوں کی
قفس میں آنکھ کھلتی ہے، چمن میں سونے والوں کی

ابھی اے عشق غارت گر نہ چھوڑ اس حال میں مجھ کو
ابھی تو ہنسنے والوں سے کمی ہے رونے والوں کی

بُرائی کرنے والوں کا بُرا انجام ہے بسمل
کنویں خس پوش ہیں راہوں میں کانٹے بونے والوں کی